اُستانی اور ٹیکسی ڈرائیور



عنایت اللہ

کی نہیں، پڑوسیوں کے گھر کی بات ہو۔

یہ دس کہانیاں چار دیواری کی دنیا کو بے نقاب کرتی ہیں۔ یہ افسانے نہیں، حقیقی زندگی کے ڈرامے ہیں۔ یہ سچی کہانیاں ہیں۔ یہ ہماری اور آپ کی داستانیں ہیں۔ کسی دوسرے گھر کی بات آپ کے اپنے گھر کی واردات ہو سکتی ہے۔

چار دیواری کی دنیا ماہنامہ "حکایت" کا مستقل عنوان ہے۔ ہر شمارے میں اس عنوان کے تحت ایک سچی کہانی شائع کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ ہم سے پوچھیں کہ کیا گھریلو عورتوں کی تحریر ایسی شستہ اور پختہ ہو سکتی ہے؟ ——جی نہیں۔ ہم نے قارئین کے لیے یہ سہولت پیدا کر رکھی ہے کہ آپ کا ادیب ہونا ضروری نہیں۔ آپ صرف واقعات لکھ دیں۔ تحریر اور طرزِ بیان کو ہم خود بہتر بنا لیں گے۔ اگر آپ لکھ نہیں سکتے تو ہمیں آپ بیتی سنا دیں۔

اس سہولت سے قارئین فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ وہ کھل کر باتیں سناتے ہیں اور ہم انہیں تحریر کا جامہ پہنا لیتے ہیں۔ یہ دس کہانیاں اسی سہولت کا حاصل ہیں۔ یہ پڑھیئے اور اپنی رائے قائم کیجیے مگر اپنے گھر کا جائزہ ضرور لیجیے۔ ہو سکتا ہے کوئی کہانی آپ ہی کے گھر کی ہو۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت"۔ لاہور

طلاق کے بعد

میرے ہونٹ سِل گئے۔ زبان میں بولنے کی طاقت نہ رہی۔ میں شاید خود بھی وہ نہیں رہی تھی جو اس گناہ خانے میں داخل ہونے سے پہلے تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ میں کیا بن گئی تھی۔

ب۔ ر

میں نے تین شیر جیسے لڑکوں کو جنم دیا ہے۔ میری پہلی ساس اور نندیں مجھے کہا کرتی تھیں کہ یہ تو تھوہر کا پودا ہے۔ زمین کا پانی پی جاتا ہے۔ نہ پھل دیتا ہے نہ پھول۔ میری کوکھ میں ریت بھری ہوئی ہے۔ میری گود کبھی ہری نہ ہو گی۔

ابھی ابھی اپنے پہلے بچے کی اٹھارہویں سالگرہ منا کر فارغ ہوئی ہوں۔ رات کے دس بج چکے ہیں۔ تین مہینے بعد دوسرے بچے کی چودھویں اور دو مہینے بعد تیسرے بچے کی دسویں سالگرہ مناؤں گی۔ آج جبکہ میرا پہلا بیٹا اٹھارہ سال کا ہو گیا ہے، دل وہ سارے دکھ اُگل دینے کو تڑپ رہا ہے جو میں نے اپنے اس بچے کی پیدائش سے پہلے جھیلے تھے۔ لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ مجھ پر جو گزری ہے وہ لکھ کر آپ کے حوالے کر دوں گی۔ آپ اس کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں کریں۔

میری کہانی عجیب و غریب اور دلچسپ نہیں۔ چار دیواری کی دُنیا ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ کسی عورت کے اولاد نہ ہوئی تو اسے طلاق مل گئی۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ میں بھی دوسری عورتوں کی طرح طلاق ملنے سے پہلے

بہت روئی تھی۔ خاوند کی منت سماجت کی تھی کہ مجھے طلاق نہ دے مگر اُس نے ایک نہ سُنی ـــــ یہاں تک تو میری کہانی وُہی ہے جو آپ نے سینکڑوں مرتبہ سُنی ہو گی۔ لیکن اس سے آگے میری کہانی ذرا مختلف ہو جاتی ہے۔

جس روز میری ڈولی سُسرال کے صحن میں اُتری، میری عمر اٹھارہ سال اور ساڑھے چار مہینے تھی۔ والدین نے مجھے ایف۔ اے سے آگے نہیں پڑھنے دیا تھا کیونکہ میری منگنی ہو چکی تھی اور لڑکے والے شادی جلدی کرنا چاہتے تھے۔ پڑھنے کا شوق مار دیا گیا اور میں کالج سے نکل کر سُسرال کے گھر میں داخل ہو گئی۔ میرا سُسرال اور میکہ متوسط درجے کے گھرانے تھے۔ خاوند نے مجھے دل و جان سے قبول کر لیا اور ازدواجی زندگی اچھی گزرنے لگی۔

پورا ایک سال ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ ساس ماؤں کی طرح اور نندیں سگی بہنوں کی طرح پیار کرتی تھیں۔ گھر کا کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ دن کے وقت زیور کے بغیر نہیں رہنے دیتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں دُلہن ہی بنی رہوں۔ میرا دُولہا ان کا اکلوتا لڑکا تھا، اس لیے وہ مجھے اس کی لاڈلی دُلہن سمجھتی تھیں۔ میں جب بھی میکے جانے کو کہتی نندیں مجھے اپنے ہاتھوں تیار کر کے میکے بھیج دیتیں۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میں ایک سال دلہن ہی بنی رہی۔

دوسرا سال شروع ہُوا تو میں نے محسوس کیا جیسے ساس مجھے بڑی غور سے دیکھتی ہے اور کبھی کبھی میں صحن میں چلتی تھی تو وہ مجھے پیچھے سے دیکھتی رہتی تھی۔ ایک روز ایک اُدھیڑ عمر عورت آئی تو ساس مجھے کمرے میں لے گئی۔ کہنے لگی کہ یہ ہماری دائی ہے۔ بے چاری کا یہی ذریعہ معاش ہے، اور کچھ نہیں تو اس سے پیٹ ملوا لو اور اسے

دو چار روپے دے دینا۔ بے چاری دُعائیں دے گی۔

مجھے پیٹ ملوانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اسے بھی ساس کا لاڈ اور پیار سمجھ کر مَیں پلنگ پر لیٹ گئی۔ ساس کمرے سے نکل گئی۔ دائی نے پہلے تو میرے پیٹ کو ٹٹولا، پھر پہلو سے دبانا شروع کیا اور ناف پر ہاتھ کر دبایا اور اس طرح دس پندرہ منٹ پیٹ مل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ کمرے کے دروازے کی طرف گئی تو مَیں بھی اُٹھ کر دروازے تک گئی۔ ساس باورچی خانے میں تھی۔ دائی کو شاید معلوم نہیں تھا کہ مَیں پیچھے کھڑی دیکھ رہی ہُوں۔ اس نے میری ساس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا جیسے اشارہ کیا ہو کہ "نہیں" ـــــ مَیں نے ساس کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ اُداس ہو گیا اور اس کا سر جُھک گیا۔ مَیں فوراً سمجھ گئی کہ میرا پیٹ کیوں ملوایا گیا ہے اور دائی نے ساس کو سر ہلا کر کیا بتایا ہے۔

مَیں نے دائی کو دو روپے دیئے اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ساس کا اُداس چہرہ میری نظروں کے سامنے سے ہٹتا نہیں تھا۔ مَیں نے پہلی بار محسوس کیا کہ ایک سال گزر گیا ہے۔ مجھے تو اب تک ماں بن جانا چاہیے تھا مگر دائی میری ساس کو مایوس کر گئی تھی۔

ایک مہینہ اور گزرا تو دائی ایک بار پھر میرا پیٹ ملنے آ گئی اور وہ سر کے اشارے سے میری ساس کو پہلے سے زیادہ مایوس کر گئی ـــــ دائی کے سر کے اشاروں ہی اشاروں میں ایک اور سال گزر گیا۔ تیسرا سال شروع ہُوا تو ساس مجھے ایک شاہ صاحب کے پاس لے گئی۔ شاہ صاحب نے کاغذ پر اُلٹی سیدھی لکیریں ڈال کر کہا ـــــ "ایک لکیر ذرا گڑبڑ کرتی ہے۔ اللہ کرے گا جگہ پر آ جائے گی۔ اگلی جمعرات کو پھر آنا۔"

ساس نے میرے ہاتھ سے پانچ روپے شاہ صاحب کو دلائے۔ اگلی جمعرات

آئی تو شاہ صاحب کے پانچ روپے اور کھرے ہو گئے مگر ساس خوش نہیں تھی کیونکہ ان کے شاہ صاحب نے کہا تھا کہ جس رُوح کو میرے گھر آنا ہے وہ ابھی ستاروں کی گردش میں بھٹک رہی ہے۔ ذرا دیر لگے گی پَر آ جائے گی۔

دو مہینے بعد گلی میں آواز آئی ـــــ "رمل۔ فال۔ دلیل" ـــــ ساس دوڑ کر باہر نکلی اور رمل فال والے کو اندر لے آئی۔ محلوں میں رہنے والوں کو معلوم ہوگا کہ قسمت کا حال بتانے والے ایسے وقت گلیوں میں آکر "رمل۔ فال۔ دلیل" کی صدا لگاتے ہیں جب مرد گھروں سے اپنے کام کاج پر نکل جاتے ہیں۔ گھروں میں صرف عورتیں ہوتی ہیں۔ چار دیواری کی دنیا کی یہ قیدی عورتیں اتنی بے بس ہوتی ہیں کہ جوتشیوں اور پیروں اور شاہ جی قسم کے لوگوں کے سہارے ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ان کی ذہنی مجبوریوں اور ان کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق ایسی اُستادی سے باتیں کرتے ہیں جو بالکل سچ معلوم ہوتی ہیں۔

ساس بھی اِنہی عورتوں میں سے تھی۔ اس نے میرا ہاتھ جوتشی کے ہاتھ میں دے کر کہا ـــــ "باباجی! اس کی گود کب ہری ہو گی؟"

اس خشخشی داڑھی والے مریل سے آدمی نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھیں پھر اپنی کتاب کھول کر مجھے کہا کہ ان خانوں میں سے کسی میں اُنگلی رکھ دوں۔ مَیں نے ایک خانے میں اُنگلی رکھ دی جس میں جل پری کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جوتشی نے تین چوکور ٹکڑے کتاب کے اس صفحے پر پھینکے۔

"پری جل سے نکل آئی ہے۔" جوتشی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "چار چاند ڈوبیں گے پھر جل میں چلی جاوے گی۔ پھر تین چاند ڈوبیں گے تو پھر جل سے نکل آوے گی۔ تب

من کی مراد پوری ہووے گی۔ چنتا نہ کر بی بی۔ ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں نہ مار۔ جل پری جل میں رہتی ہے۔ بڑی بھاگوان ہے۔ گھر میں جل تھل کر دیوے گی۔ ایک روپیہ تیرہ آنے پوتھی پر دھر دے۔ تیرے کو کچھ ہور بتاویں گے۔ جوتشی بابا کے من میں کدی کدی موج آتی ہے۔"

جوتشی بابا من کی موج میں پانچ روپے نو آنے لے کر چلتا بنا مگر باتیں ایسی کر گیا کہ ساس اور نندوں کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر چار چاند ڈوب گئے اور پھر تین اور چاند ڈوب گئے۔ جل پری نے جل تھل نہ کیا۔ دائی نے میرا پیٹ ملا۔ سراغرسانی کی اور سر کا وہی پرانا اشارہ کر کے چلی گئی اور ساس کا چہرہ اس طرح اُتر گیا جیسے اس کی جل پری ہمیشہ کے لیے جل میں ڈوب گئی ہو۔

ازدواجی زندگی کا تیسرا سال بھی گزر گیا اور ساس اور نندوں کا لاڈ اور پیار بھی گزر گیا۔ مَیں گھر کے کام میں جتی رہنے لگی۔ خاوند کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ایک روز وہ مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے میرا معائنہ کیا اور تین دوائیاں لکھ دیں۔ پندرہ دنوں کا کورس تھا۔ یہ ختم کیا تو لیڈی ڈاکٹر نے ایک بار پھر معائنہ کیا۔ اس نے علیحدگی میں مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ میرے خاوند کے متعلق بھی کئی ایک سوال کیے۔ پھر اُس نے میرے خاوند کو بُلا کر کہا کہ وہ بھی کسی اچھے ڈاکٹر سے معائنہ کرا لے۔ یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام عجیب سا ہوتا ہے۔ ذرا سی خرابی کے نتائج بہت بڑے ہوتے ہیں۔ آپ کا علاج ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

مَیں نے گھر آ کر خاوند سے کہا کہ وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر لے، مگر وہ اس طرح بھڑک اُٹھا جیسے مَیں نے اس کی مردانگی پر کوئی بڑی ہی توہین آمیز تہمت لگا دی ہو۔

"نقص تم میں ہوگا" ۔۔۔ اُس نے کہا۔ "مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ اپنے متعلق خود رائے قائم نہ کریں"۔ مَیں نے کہا۔ "آپ کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے" ۔۔۔ میرا مطلب کچھ اور تھا مگر وہ کچھ اور سمجھا۔ اس کی آنکھیں ٹھہر سی گئیں اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔

مَیں نے اپنی دو شادی شدہ سہیلیوں کو اپنے خاوند کے متعلق یہ بات سنائی تو انہوں نے کہا کہ کسی مرد کو ماں بہن کی گالی دے دو تو وہ برداشت کر لیتا ہے لیکن یہ مشورہ کبھی برداشت نہیں کرتا کہ کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرا لے۔ انہوں نے بتایا کہ خاوند کی نظر میں ہر نقص عورت میں ہوتا ہے۔ مرد اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتا ہے۔ اگر کسی بیوی کو اپنے خاوند کے جراثیم سے ٹی بی ہو جائے تو تھوڑے سے عرصے بعد سُسرال والے مشہور کر دیتے ہیں کہ ان کی بہو نے ان کے بیٹے کو ٹی بی لگا دی ہے۔

مَیں نے دیکھا کہ میرے خاوند کا موڈ خراب رہنے لگا اور اس کے ساتھ ہی ساس اور نندوں کا سلوک بھی بدل گیا۔ پھر سُسر مجھے راولپنڈی دو لیڈی ڈاکٹروں کے پاس لے گیا۔ صبح ایک سے معائنہ کرایا۔ شام دوسری سے کرایا۔ دونوں نے معائنہ کر کے اور بتیس بتیس روپے فیس لے کر کہا کہ مَیں بالکل ٹھیک ہوں اور دونوں نے میرے سُسر سے کہا کہ اس کے خاوند کا بھی معائنہ کرا لو۔ مگر سُسر نے اپنے بیٹے کی وکالت کرتے ہوئے دونوں سے کہا ۔۔۔ "وہ تو ٹھیک ہے۔"

مَیں نے واپس آ کر خاوند کو بتایا کہ لیڈی ڈاکٹروں نے کیا فیصلہ دیا ہے۔ وہ کچھ بھی نہ بولا مگر اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ بول رہا تھا کہ اسے یہ فیصلہ سخت ناگوار

گزرا ہے۔

میں پوٹھوہار کے علاقے کی رہنے والی ہوں جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پُہنچ والے" پیروں کے مزار اور گدّیاں ہیں۔ مجھے تین چار مزاروں اور خانقاہوں پر لے جایا گیا۔ وہاں کی "خاک" اور کنکریاں کھلائی گئیں اور کرتے کرتے میرے گلے میں پانچ تعویذ ٹکنے لگے مگر جل پری نے جل تھل نہ کیا۔ ساس مجھے گولڑہ شریف بھی لے گئی میری ماں مجھے دیول شریف لے گئی۔ نوگنزے کی قبر پر بھی مجھے لے جایا گیا۔ حسن ابدال "زندہ پیر" کے مزار پر بھی لے گئے، مگر میری قسمت میں وہی طعنہ لکھا تھا جو چار دیواری کے پاگل خانے میں اکثر سنائی دیتا ہے ——"یہ تو تھوہر کا پودا ہے۔ زمین کا پانی پی جاتا ہے۔ نہ پھل دیتا ہے نہ پھول"۔

سب سے پہلے مجھے یہ طعنہ ساس نے دیا تھا پھر مجھ پر ایسے ایسے تیر برسنے لگے کہ شادی کی پہلی رات اور پہلا سال ایک حسین خواب کی طرح یاد رہ گیا، پھر میں نے اس خواب کو بھی ذہن سے اُتار دیا۔ مجھے در و دیوار سے نفرت ہو گئی۔ خاوند بیگانہ ہو گیا۔ نندیں مُنہ بسورنے لگیں۔ پھر ساس مجھے اس طرح کام بتانے لگی: "تو ہماری اور کیا اُمید پوری کرے گی۔ جھاڑو ہی پھیر دے ذرا" —— یا یہ کہ —— "سوکھے پیڑ سے بھی ایک ہرا پتّا پھوٹ آتا ہے۔ جا ذرا برتن مانجھ دے۔ کب تک کھُرے میں ڈھیر لگا رہے گا"۔

جس چوٹ نے مجھے اَدھ موا کر دیا وہ یہ تھی کہ مجھ سے میری سہیلیاں چھوٹ گئیں۔ وہ آتی تھیں یا میں ان کے پاس چلی جاتی تھی تو دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جاتا تھا لیکن سبھی مجھ سے دُور ہٹنے لگیں۔ مجھے اپنی ماں نے بتایا کہ میری سہیلیوں کو یہ کہہ کر ڈرایا گیا ہے کہ مجھ پر کسی چیز کا سایہ ہے اور میں کسی پیر فقیر کی بد دُعائی ہوئی ہوں، اور جس سُہاگن پر

میرا سایہ پڑے گا اس کی بھی کوکھ سُوکھ جائے گی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دل میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ میں جاہل اور اَن پڑھ نہیں تھی کہ تنہائی میں رونے بیٹھ جاتی، مگر مجھے ایک خیال آ گیا۔ وہ یہ کہ میں جوابی کارروائی کے طور پر ساس اور نندوں کے مُنہ آئی تو وہ میرے خاوند کو بھڑکا کر مجھے طلاق دلا دیں گی۔ اگر طلاق کا تعلق صرف میری ذات سے ہوتا تو میں پرواہ نہ کرتی مجھے اپنے ماں باپ کا زیادہ خیال تھا۔ یہ صدمہ وہ کیسے برداشت کرتے۔ میں نے دل کے شعلے دل میں روکے رکھے اور میرا دل جلتا رہا۔

میکے کے محلّے کی صرف ایک سہیلی نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ میری ہمراز تھی اور ہماری دوستی دلوں میں اُتری ہوئی تھی۔

ازدواجی زندگی کا چھٹا سال تھا جب سُسرال سے مجھے اشارہ مل گیا کہ اب طلاق کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ شروع شروع میں اشارے سے ملتے رہے۔ آخر ایک روز میری ساس نے میری ماں سے جا کر بڑی لمبی تمہید باندھ کر کہا کہ ان کا ایک ہی لڑکا ہے۔ اگر اس کی اولاد نہ ہوئی تو جائیداد کا وارث کون ہو گا۔ نسل ختم ہو جائے گی۔ اس لیے تم لوگ ہمیں اجازت دو کہ ہم اپنے بیٹے کی دُوسری شادی کرا دیں اور اگر تم چاہو تو تمہاری بیٹی کو طلاق دے دیں۔

میری ماں نے مجھ سے جب بات کی تو وہ اتنی روئی کہ ہچکیاں لینے لگی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کی ہچکیاں اور آنسو کبھی نہیں تھمیں گے۔ میں بھی رونے لگی۔ غصّے کا یہ عالم کہ میرے دانت بجنے لگے۔ دل میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

میں تو سب کے مُنہ چڑیلوں کی طرح نوچنے کے لیے تیار ہو گئی لیکن بار بار یہ خدشہ مجھے بے بس کر دیتا تھا کہ مجھے طلاق ہو گئی تو مجھ سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا

کیونکہ سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں بچے جننے کے قابل نہیں۔ دوسری شادی کا خیال مجھے صرف ماں باپ کی خوشنودی کے لیے آتا تھا۔ ماں باپ کی یہی ایک خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹیاں جب گھر جائیں سُکھی رہیں۔ گھر بیٹھی بیٹی ماں باپ کے لیے بے عزتی کا باعث ہوتی ہے۔

برداشت کرنے کے باوجود میں منہ پھٹ ہوگئی۔ یہ تو بچپن سے ہی میری عادت تھی کہ مُنہ آئی بات کہہ گزرتی تھی۔ کوئی بُرا مناتا ہے تو مناتا رہے۔ میں نے ساس اور نندوں کو کھری کھری سُنانی شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آئے دن جھک جھک ہونے لگی۔ مگر ہار مجھے ہی ماننی پڑتی تھی کیونکہ ماں باپ کی وجہ سے میں طلاق سے بہت ہی ڈرتی تھی۔

ایک روز پھر تُو تُو میں میں ہوگئی اور میں میکے گھر کو چل دی۔ ارادہ تھا کہ شام کو واپس آجاؤں گی۔ تانگے میں بیٹھی اور اپنے گھر جا پہنچی۔ وہاں تالا لگا ہُوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ گھر کے سب لوگ کہیں چلے جائیں تو چابی ساتھ والے گھر دے جاتے ہیں۔ میں ساتھ والے گھر گئی تو وہاں اس گھر کا ایک جوان سال آدمی اکیلا بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں اور میری ماں میری ہی خاطر کسی خانقاہ پہ چلی گئی ہیں۔ میرے ابّا جان دفتر اور دونوں بھائی کالج گئے ہوئے تھے۔ یہ آدمی شادی شدہ تھا اس کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی تھی، کیونکہ بہت ہی بدتمیز اور جاہل قسم کی عورت تھی۔ اس آدمی کے ساتھ پڑوسی ہونے کی وجہ سے اچھی جان پہچان تھی۔ اس کی بیوی چھ سات مہینوں سے میکے گئی ہوئی تھی۔ یہ آدمی اسے واپس نہیں لانا چاہتا تھا۔

اُس نے مجھے بٹھا لیا اور اپنی بیوی کا رونا رونے لگا۔ میں نے اسے اپنی مصیبت

کی کہانی سُنا دی۔ اپنی پرانی عادت کے مطابق کوئی بات نہ چھپائی۔ اپنے خاوند کا سلوک بھی اسے بتایا اور یہ بھی کہ وہ اپنا ڈاکٹری معائنہ کرانے سے گھبراتا ہے۔ پھر میں نے اس آدمی کو بتایا کہ میں طلاق سے بہت ڈرتی ہوں کیونکہ اس سے میرے ماں باپ کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ خدا مجھے صرف ایک بچہ دے دے۔

اس مسئلے پہ باتیں کرتے کرتے یہ آدمی کچھ زیادہ ہی بے تکلفی پر اُتر آیا، اور اچانک میرے اندر انتقام اور بغاوت کا شعلہ اُٹھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا — "مجھے ایک بچہ چاہیے۔ خاوند کو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ یہ بچہ اُس کا نہیں!" — میری جذباتی حالت میرے قابو سے باہر ہوگئی اور عین اس وقت اُس آدمی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا — "تمہیں ایک بچہ چاہیے۔ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں" — میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ہماری نظریں ٹکرائیں۔ میں نے اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ایک بچے کی جھلک دیکھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہ چھڑایا۔

وہ اُٹھا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کواڑ جب ایک دوسرے سے ٹکرائے تو یہ ذرا سا کھٹکا میرے سینے میں توپ کے دھماکے کی طرح گرجا۔ میری غیرت بیدار ہوگئی۔ میرا جسم اتنی زور سے کانپا جیسے کسی غیبی قوت نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا ہو۔ "آبرو کی خاطر مسلمان بیٹیاں جان پر کھیل جاتی ہیں۔ تم اتنی جلدی ہار گئیں؟ خدا کی ذات سے مایوس نہ ہو لڑکی۔ ہوش میں آ۔"

وہ دروازہ بند کر کے میری طرف آیا اور میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اسے کہا — "مجھے معاف کر دینا" — اور میں اس سے اپنے گھر کی چابی لیے بغیر باہر آگئی۔

میں نے گناہ نہیں کیا تھا لیکن گناہ کا ارادہ ضرور کر لیا تھا۔ یہی ارادہ مجھے سانپوں کی طرح ڈنک مارنے لگا۔ گلی میں آئی تو ایسے گھبراہٹ ہونے لگی جیسے دیواریں مجھ پر لعنت بھیج رہی ہوں۔ جیسے پاس سے گزرتے لوگ مجھے نفرت سے گھور رہے ہوں۔ میں کوئی ایسی پناہ ڈھونڈنے لگی جو مجھے گناہ کے احساس سے نجات دلا دے۔ مجھے اپنی ہمراز سہیلی یاد آگئی تو میں بہت ہی تیز چلتی اُس کے گھر جا پہنچی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میرے آنسو بہہ رہے ہیں ورنہ مجھے تو اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ اپنے آنسو محسوس کر سکتی۔

میری سہیلی میرے دُکھ سے واقف تھی۔ اُس نے جب میری طلاق کے متعلق بات شروع کی تو میں نے اسے کہا کہ آج میرے آنسو اپنے سہاگ کے غم میں نہیں کسی اور وجہ سے بہہ رہے ہیں۔ اُس نے پوچھا تو میں ذرا بھر نہ جھجکی اور اسے ساری واردات سُنا دی۔ میں اپنے ضمیر سے اس گناہ کا بوجھ اُتار پھینکنا چاہتی تھی، جو میں نے کیا نہیں تھا، صرف سوچا تھا۔

میری سہیلی افسردہ ہو گئی۔ میں سمجھی کہ وہ میری ایسی ناشائستہ حرکت پر ناراض ہو گئی ہے۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا ــــ "اللہ کی قسم، میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں۔ گناہ کیا نہیں"۔

اُس نے کہا ــــ "یہی تم نے غلطی کی ہے کہ تم نے گناہ کیا نہیں۔ اب گناہ نہ کرنے کی سزا بھگتو اور طلاق لے کر ماں باپ کے گھر آ بیٹھو۔ کوئی مائی کا لال ایسا نہیں ہوگا جو تمہیں بیاہ لے جائے گا۔ تمہاری ماں کی طرح ہر کوئی تمہیں کہے گا کہ یہ بنجھ ہر کا پودا ہے"۔

میں حیرت سے منہ کھولے اُسے دیکھنے لگی۔ اس نے بڑی لمبی آہ لی اور ایک عورت کے متعلق اس نے وثوق سے بتایا کہ وہ بھی اس گناہ سے بہت بھاگی تھی مگر اس کے

سامنے طلاق کا بھوت کھڑا تھا۔ اس کا خاوند بھی تمہارے خاوند کی طرح ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کا پہلا بچہ شادی کے آٹھویں سال پیدا ہوا تھا اور دوسرا گیارہویں سال۔ پہلے بچے نے اسے طلاق سے صاف بچا لیا ــــ لیکن یہ بچہ اس کے خاوند کا نہیں ــــ اور دوسرا بھی اس کے خاوند کا نہیں۔ پہلا اُس پیر کا ہے جس کے پاس اسے ساس لے جایا کرتی تھی لیکن بچہ اس کے تعویذوں کا کرشمہ نہیں اس کے کرتُوت کی پیداوار ہے۔ اس نے ایک بچے کی خاطر یا طلاق سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو پیر کے حوالے کر دیا تھا۔ خدا نے اس کے گناہ سے اس کی گود ہری کر دی۔ پھر ایک سال بعد اپنی برادری کے ایک آدمی نے اسے دُوسرا بچہ دیا اور سُسرال میں اس کا وقار بحال ہو گیا۔ سُسرال والے اسے بھاگوان سمجھنے لگے جس نے انہیں دو لڑکے دیئے ہیں۔ خاوند کا سر اُونچا ہو گیا تھا کہ وہ لڑکوں کا باپ ہے۔

میں تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ایسے ہُوا ہے۔ میں نے ہنس کر اسے کہا ــ "کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں نہیں مانتی"۔

"سُن میری بہن!" اُس نے کہا۔ "اولاد کی خاطر پیروں کے پاس جانے والی عورتوں کی گود تعویذ نہیں، پیر خود ہری کیا کرتے ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جس عورت کو طلاق کی دھمکیاں اور بانجھ پن کے طعنے ملتے رہیں اور وہ اپنے ماں باپ کی عزت اور اپنے مستقبل کی خاطر طلاق سے سخت خوفزدہ ہو اور اس کی گود ایک عرصے بعد ہری ہو جائے تو یہ بچہ اس کے خاوند کا ہی ہوگا۔ ہمارے گھرانوں میں ایک فریب کی حکمرانی ہے۔ یہ فریب ہم دوسروں کو بھی دیتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی۔ تمہیں اپنی آبرو اتنی پیاری ہے تو طلاق لو اور گھر آ بیٹھو اور ساری عمر اسی گھر میں گزار دو"۔

میں اپنے آپ کو اس فریب کاری کے لیے تیار نہ کر سکی۔ اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ میری نجات ایک گناہ میں ہے ورنہ میں ہمیشہ کے لیے دھتکاری جاؤں گی تو میرے اندر ایسی بے چینی اور تلخی پیدا ہو گئی کہ بیٹھے چین نہ لیٹے چین۔ پاگل پن سا سوار ہو گیا اور جی میں یہی ایک ارادہ آتا کہ خودکشی کر لوں۔ ریل گاڑی کے نیچے سر رکھ دوں، ڈوب مروں، زہر کھا لوں۔ پھر یہ ارادہ پختہ ہو گیا اور جس طرح میں گناہ اور طلاق کی کش مکش میں کچلی جا رہی تھی، اب طلاق اور خودکشی کے دو پتھروں میں پسنے لگی۔

دو تین دنوں بعد مجھے خاوند نے صاف کہہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرے گا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ پہلے سال والی محبت کے واسطے دیئے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہاں تک گرا دیا کہ اس کے پاؤں میں سر رکھ دیا۔ وہ پتھر بن چکا تھا لیکن میری منت سماجت اور واسطوں نے اسے ذرا سا نرم کر دیا۔

"میری امی ایک اور پیر کا نام لے رہی تھیں۔" اس نے کہا۔ "میں انہیں کہوں گا کہ تمہیں وہاں لے جائیں۔ اگر وہاں سے بھی مراد پوری نہ ہوئی تو پھر میں طلاق دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

میں اس پیر کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں نے خاوند سے کہا کہ میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ خاوند نے فوراً کہا ——"پھر طلاق لے لو"—— اور یہ بھی کہا —— "یہ تمہارا نہیں تمہاری تعلیم کا قصور ہے۔ تم ایف۔ اے کر کے اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سمجھتی ہو۔ تم پیروں اور بزرگوں کی توہین کی سزا پا رہی ہو۔"

اس نے یہ تو ٹھیک کہا تھا کہ میں پیروں اور "بزرگوں" کی توہین کرتی ہوں لیکن یہ صحیح نہیں تھا کہ میں ایف۔ اے کی ڈگری پر فخر کرتی تھی۔ مجھ پر غموں کے ایسے پہاڑ

آن پڑے تھے کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں نے ایف۔ اے تک تعلیم پائی ہے۔ خاوند نے مجھے یاد دلایا تو اس کے ساتھ مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ میں نے قرآن بھی پڑھا تھا اور اس مقدس کتاب کو خدا کا پیغام مانا کرتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے ایک روشنی سی چمکی ہو۔ مجھے عقل نے راہ دکھائی اور میں نے خاوند سے کہا کہ میں اس پیر کے پاس جاؤں گی۔

میں اس پیر کا نام نہیں لوں گی۔ وہ خود تو اٹھارہ انیس سال گزرے ایک حادثے میں مر گیا تھا لیکن اس کی گدی زندہ ہے۔ اگر اس کا نام لے بیٹھی تو ہتکِ عزت کا مقدمہ الگ بنے گا اور اس کے مرید آپ کی جان کو آ جائیں گے۔ اتنا بتا دیتی ہوں کہ یہ پوٹھوہار کے علاقے کا ایک گمنام سا پیر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے "بے اولاد عورتوں کو اولاد دینے والا مرشد" بن گیا اور وہ دُور دُور تک مشہور ہو گیا۔ اس کی زیادہ "شہرت اور عزت" عورتوں کے دل میں تھی۔ میں اس پیر کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

دو تین دنوں بعد میں اپنی ساس کے ساتھ ریل گاڑی سے اس سٹیشن پر اتری جس کے قریب پیر کی گدی تھی۔ سٹیشن سے پیدل پیر کے گھر پہنچے۔ جناب پیر صاحب مریدوں کی محفل میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان پر وجد طاری ہو گیا۔ ساس نے آگے ہو کر ان کے پاؤں چھوئے پھر مجھے بھی آگے کر کے ان کے پاؤں چھونے کو کہا۔

ساس اپنی مراد بیان کرنے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے ایک آدمی نے (جو پیر کے جرائم میں شریک تھا) میری ساس کو کان میں کہا —— "یہاں نہیں۔ اس وقت حضور کسی اور حالت میں ہیں۔ لڑکی کو اندر بھیج دو۔ حضور مرادیں وہیں سنتے ہیں"—— اس کے ساتھ ہی اس آدمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"کاکی! اُدھر اندر چلی جا۔ حضور کرم کریں گے۔ اس دربار سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں گیا"۔

میرا جسم بڑی زور سے کپکپایا۔ ساس نے مجھے اُٹھا دیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

"جا چلی جا اندر۔ حضور اندر آئیں تو پاؤں چھو کر بات کرنا"۔

میرا دماغ یکلخت خالی ہوگیا۔ میں اُس دروازے کے اندر چلی گئی۔ اندر پلنگ بچھا تھا اور اس پر قیمتی تکیے اور پلنگ۔پوش تھا۔ کمرہ بہت سجا ہُوا تھا۔ فوراً ہی پیر صاحب کمرے میں آگئے اور دروازہ بند کر دیا۔ اس پیر کی صحت قابلِ رشک تھی۔ چہرہ خوبصورت اور لال سُرخ۔ جسم توانا۔ اس شخص کے چہرے اور جسم میں بڑی کشش تھی۔ اس نے آتے ہی مخمور آواز میں کہا ــــ "بچہ نہیں ہوتا؟" ــــ اور خود ہی جواب دیا ــــ "ہو جائے گا"۔ اور اس نے مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔ میں نے کھڑے کھڑے جواب دیا ــــ "مجھے تعویذ چاہیے۔ میں یہاں لیٹنے کے لیے نہیں آئی"۔

وہ ہنس پڑا۔ اگر شیطان میرے سامنے ہنسے تو میں قسم کھا کر کہوں گی کہ شیطان اس پیر کی طرح ہنستا ہے۔ میں سنجیدہ ہوگئی۔ وہ میرے قریب آگیا اور کہنے لگا۔

"تعویذ بھی دوں گا اور بچہ بھی دُوں گا"۔ ــــ اور اُس نے ایک بازو میری کمر کے گرد لپیٹ کر مجھے پلنگ پر گرا دیا۔ وہ تو ایک خوبصورت بھینسا تھا۔ اسے دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ جاہل عورتیں کیوں اس کی گرویدہ ہیں۔ وہ مجھے بھی انہی عورتوں میں سے سمجھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے سخت متعفن بدبو آرہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ شراب کی بدبو تھی یا چرس کی۔ مجھے پلنگ پر گرا کر وہ پلنگ پر چڑھ آیا۔ میں اُچھل کر پلنگ سے اُٹھی اور اس سے تین چار قدم دُور ہٹ گئی۔

اس نے پیار سے مجھے اپنے پاس بلایا لیکن اسے بالکل علم نہیں تھا کہ میں اب

عورت نہیں رہی۔ اس نے کہا ــــ "ایسا تعویذ دُوں گا جو۔۔۔" معلوم نہیں وہ تعویذ کی کونسی کرامات بیان کرنے لگا تھا کہ میں نے اس آتشیں قوت کے زور پر جو اچانک میرے اندر جاگ اُٹھی تھی، اسے بولنے نہ دیا، اور اسے کہا: "میں تھوکتی ہوں تیری صورت پر اور تیرے تعویذوں پر۔ اب میں اپنا تعویذ آزماؤں گی۔ میں گمراہ ہوگئی تھی۔ میں تجھے بتاؤں گی کہ تیرے تعویذ میں اثر ہے یا میرے قرآن میں۔ میرا قرآن برحق ہُوا تو تجھ پر لعنت پڑے گی"۔

اس نے قہقہہ لگا کر کہا ــــ "قرآن۔۔۔۔ اوہ پاگل لڑکی۔۔۔۔" اُس نے قرآن کے نام پر طنزیہ قہقہہ لگایا اور پلنگ سے اُٹھنے لگا۔ میں تیزی سے کمرے سے نکلی اور مریدوں کے دربار سے تیز تیز چلتی باہر آگئی۔ میری ساس بھی باہر آگئی اور پوچھنے لگی ــــ "حضور نے کیا کہا ہے؟" میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے ہونٹ سِل گئے تھے۔ زبان میں بولنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ میں شاید خود بھی وہ نہیں رہی تھی جو اس گناہ خانے میں داخل ہونے سے پہلے تھی۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ میں کیا بن گئی تھی۔ میرے سینے میں کوئی چیز داخل ہوگئی تھی۔ ساس کچھ نہ کچھ بولتی رہی اور میں بالکل ہی چپ رہی۔ دو تین بار اسے کوئی جواب دینے کی کوشش کی لیکن نہ دل نے ساتھ دیا نہ زبان نے۔

شام کے وقت ہم اپنے گھر پہنچیں۔ میں نے ساس سے کہا کہ اپنے گھر جا رہی ہوں اور میں اپنے گھر آگئی۔ ماں بے چاری بہت پریشان تھی۔ اسے دیکھ کر میری زبان ذرا کھُل گئی۔ میں نے اسے تسلّی دی کہ اللہ اپنا کرم کرے گا۔ جو ہوگا انشاءاللہ بہتر ہوگا۔

میں رات اپنے گھر رہی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ میں اس وقت تک سو نہیں سکی تھی۔ دماغ میں عجیب عجیب خیال آتے تھے اور ادھورے ادھورے نکل جاتے تھے۔ اپنی بدقسمتی پر رونا بھی آتا تھا اور میں یہ بھی سوچتی تھی کہ چار دیواری کی دنیا میں عورتوں کے ساتھ کیا کیا دھاندلیاں ہوتی ہیں جن سے مجبور ہو کر عورتیں اپنی نجات کے راستے خود ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ ان کی ایسی زمین دوز حرکتیں چار دیواری کی دُنیا کا ایسا بھید ہیں جنہیں خدا کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا اور مرد فخر سے گردنیں اکڑائے رکھتے ہیں۔

میں سو نہ سکی۔ گھر کے تمام افراد گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں نے غسل خانے میں جا کر ٹھنڈے یخ پانی سے وضو کیا۔ یہ سردیوں کی رات تھی۔ وضو کر کے الماری سے قرآن مجید نکالا اور چھت پر چلی گئی۔ یخ ہوا چل رہی تھی۔ میں نے قرآن فصیل پر رکھا اور ننگی چھت پر دو نفل پڑھے۔ اس دوران میں اتنی زیادہ روئی کہ نفل اچھی طرح پڑھ بھی نہ سکی۔ نفل پڑھ کر میں نے کوئی دُعا نہ لی۔ قرآن ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو کر اور (اللہ مجھے معاف کرے) میں نے خدا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اگر تیری ذات کا وجود ہے اور اگر تیری یہ کتاب برحق ہے تو مجھے اپنا آپ دکھا۔ مجھے اپنی کتاب کا کرشمہ دکھا۔ ورنہ اسے میں لفظوں کا پلندہ سمجھوں گی اور ساری عمر تیرا نام نہیں لوں گی"۔۔۔ (اللہ مجھے معاف کرے) پھر میں کھڑے کھڑے اتنا روئی کہ اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں نے قرآن مجید کو سینے سے لگا لیا اور میں روتی ہی رہی۔

پھر معلوم نہیں میں کتنی دیر روتی رہی اور کب نیچے اُتری۔ جب امّی نے جگایا تو سُورج نکل آیا تھا۔ سب سے پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ رات کا واقعہ تھا۔

مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے وہ خواب تھا۔ ڈر بھی آرہا تھا اور مجھ میں دلیری بھی آگئی تھی۔ اس کیفیت میں ایک ارادہ دل سے اُٹھا کہ قرآن پڑھوں۔ میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر قرآن پڑھنے بیٹھی تو تین سیپارے پڑھ ڈالے۔ میں ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے میرا دماغ روشن ہو گیا ہو اور مجھے کوئی پناہ ضرور مل جائے گی۔

میں نے اپنے خاوند کے نام ایک خط لکھا، جس میں پہلی رات سے گزشتہ رات تک کی داستان لکھی اور آخر میں لکھا کہ مجھے فوراً طلاق دے دو۔ پورا حق مہر وصول کروں گی۔ ماہوار خرچ تمہیں معاف کرتی ہوں۔ میں تمہاری محتاج نہیں رہنا چاہتی۔ اب میں تمہارے گھر نہیں آؤں گی۔ میری جو چیزیں تمہارے گھر میں ہیں بھیج دو تو اچھا ہے، نہیں تو دوسری بیوی کو دے دینا۔

بھائی کالج سے آئے تو میں نے چھوٹے بھائی کو یہ خط بند کر کے دیا اور اسے کہا کہ میرے سُسرال والوں کے گھر پھینک آئے۔ میں نے جب امّی اور ابّا کو بتایا کہ میں نے کیا لکھا ہے تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے انہیں تسلّی دی کہ جو ہوگا بالکل ٹھیک ہوگا۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا ۔۔۔ "اگر میرا خدا سچا ہے تو ہماری مدد کرے گا"۔۔۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے میں نے یہ دیکھا کہ جس طرح پہلے طلاق کا نام سن کر میں کانپ جاتی تھی اب مجھ میں دلیری آگئی تھی اور کوئی غیبی قوّت تھی جو مجھے اندر ہی اندر یقین دلا رہی تھی کہ اللہ سب ٹھیک کرے گا۔

آٹھ دس دن بعد میرا طلاق نامہ آگیا۔ اس کے ساتھ تین ہزار روپیہ بھی آگیا اور میرے کپڑوں کا ٹرنک بھی آگیا۔ البتہ زیور کی دو تین چیزیں وہ لوگ ہضم کر گئے۔ میں نے امّی اور ابّا جان سے کہا کہ رہنے دو۔ ان بے چاروں کو زیور کا نہیں میرا غم کھائے

جا رہا تھا۔ انہیں یہی خطرہ تھا کہ میری دوسری شادی نہیں ہو سکے گی کیونکہ میں ٹھوہر کا پودا ہوں۔ لیکن مجھے اب کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ہمارا وہی پڑوسی جو اپنی بیوی سے نالاں رہتا تھا اور جس کے ساتھ میں بھٹک چلی تھی، میری نجات کا سبب بن گیا۔ میرے طلاق نامے کے تھوڑے ہی دن بعد اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ پتہ چلا تھا کہ اس کی بیوی میں کوئی دماغی نقص تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ماں بدطینت عورت تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو یہی ایک سبق دیتی تھی کہ خاوند سے پیسے بٹور کر لے آیا کرو۔ اور وہ ایسے ہی کرتی تھی۔ یہ بھی سُنا تھا کہ اُس میں شرم اور عزّت کا بھی پاس نہیں تھا۔ میکے میں وہ بدنام بھی تھی۔

ایک روز میں اپنی چھت پر کھڑی تھی۔ میرا پڑوسی اپنی چھت پر چڑھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں مسکرا دیئے۔ وہ ذرا قریب آگیا اور فصیل سے ذرا پرے رُک کر بولا — "میری بھی چھُٹی ہو گئی ہے" — میں نے جواب دیا — "مُوج کرو" — اُس نے کہا — "اکیلے اکیلے خاک مَوج ہوتی ہے" — اور میں نے اس کی آنکھوں کی زبان سمجھ لی۔ اسی روز امّی سے کہا کہ اس آدمی سے رشتے کی بات کرو۔ امّی نے ابّا جان کو کہا اور دو چار پھیروں میں بات طے ہو گئی۔ طلاق کے چوتھے مہینے نہایت خاموشی سے ہماری شادی ہو گئی۔

مجھے اور میرے ماں باپ کو اب یہی ڈر تھا کہ اب کیا ہو گا؟ لیکن خدا نے اپنے نام کی اور اپنے پاک کلام کی لاج رکھ لی۔ تیسرے مہینے میں نے امّی کی پریشانی دھو ڈالی اور شادی کے دوسرے سال کے آغاز میں ہی خدا نے مجھے یہ بچّہ عطا کیا جس کی اٹھارہویں سالگرہ ابھی ابھی منا کر دل کا غبار کاغذ پر اُگلنے بیٹھ گئی ہوں۔ پھر خدا نے

مجھے دو اور بیٹے دیئے۔

اب اُس پیر کا انجام سُنیئے جو بے اولاد عورتوں کو اولاد "عطا" کیا کرتا تھا۔ اس نے میرے منہ سے قرآن کا نام سُن کر طنز یہ قہقہہ لگایا تھا۔ میرے پہلے بچّے کی پیدائش سے پانچ مہینے پہلے یہ پیر ایک بس میں کہیں جا رہا تھا کہ بس گوجر خان اور جہلم کے درمیان بے قابو ہو کر سڑک سے ہٹ گئی اور اسی رفتار سے ایک مضبوط درخت سے ٹکرا گئی۔ اس میں چھبیس سواریاں مر گئیں جن میں یہ پیر اور اس کے متعدد مرید بھی تھے۔ لوگ بتاتے تھے کہ ٹکّر اتنی شدید تھی کہ بس کا انجن بس کے دور اندر تک چلا گیا تھا۔ آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ مسافروں کی لاشوں کا کیا حشر ہُوا ہو گا۔ پوٹھوہاریوں کو اٹھارہ اُنیس سال پہلے کا یہ حادثہ ضرور یاد ہو گا اور بہتوں کو یہ بھی سراغ مل گیا ہو گا کہ پیر کون تھا اور اس کی گدّی کہاں تھی۔

میرے پہلے خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور وہ آج تک بے اولاد ہے۔

* *

چار دیواری کے پاگل خانے سے
پاگل خانے کی چار دیواری تک

مَیں نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو میرے سینے میں آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو میرے خاوند کو شالامار باغ میں ملی تھی۔ اِس ڈائن نے مجھے پاگل خانے تک پہنچایا تھا

راشدہ صدیقی

"وہ تو مجھے پاگل خانے میں داخل کرانے کے لیے لے گئے تھے لیکن ڈاکٹر خدا ترس آدمی تھا جس نے میرے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ کچھ دن علاج کرا کے دیکھ لو۔ خدا کا شکر ہے کہ گھر والے مان گئے اور میری زندگی تاریک ہونے سے بچ گئی۔"

یہ الفاظ ایک عورت کے ہیں۔ میری ایک سہیلی نے اس سے تعارف کرایا اور بتایا تھا کہ سترہ اٹھارہ سال گزرے وہ پاگل ہو گئی تھی کیونکہ اسے پتہ چلا تھا کہ اس کے خاوند کے تعلقات ایک اور لڑکی کے ساتھ ہیں۔ وہ دو سال تک دماغی خرابی کا شکار رہی۔ آخر اسے پاگل خانے میں لے گئے جہاں اسے ایک ڈاکٹر نے داخل ہونے سے بچا لیا اور وہیں اس کا آمنا سامنا اُس لڑکی سے ہو گیا جس کے ساتھ اُس کے خاوند کے تعلقات تھے۔ اس ملاقات نے اُس کا دماغ درست کر دیا۔ اس نے اپنی کہانی جس طرح سُنائی وہ میں اُسی طرح سُنا دیتی ہوں۔

میں غریب ماں باپ کی لڑکی تھی۔ برادری کے ایسے گھرانے میں میری شادی ہوئی جہاں رزق کی تنگی نہیں تھی۔ خدا نے خاوند ایسا عطا کیا جو مجھے دل و جان سے چاہتا تھا۔

میں ایسے گھر میں پلی تھی جہاں ماں باپ کو بچّوں کا پیٹ بھرنے اور میری شادی کے لیے پیسہ پیسہ جوڑنے کا فکر لگا رہتا تھا۔ آمدنی کم اور اخراجات زیادہ تھے۔ بچّوں کو تعلیم دلانا بھی ضروری تھا اور مجھے تو انہوں نے صرف اس لیے میٹرک تک پڑھایا تھا کہ میں کسی کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہی جا سکوں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گھر میں تنگدستی رہتی تھی جس سے دل بھی تنگ ہو گئے تھے۔

ماں باپ، ہمارے ہی غم میں ہلکان ہوتے ہوتے یہ بھول گئے تھے کہ ہمیں پیار کی بھی ضرورت ہے۔ ہم پیار سے محروم رہے۔ میری اور میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی کوئی فرمائش نہیں ہوتی تھی نہ ہمیں فرمائش کا حق حاصل تھا۔ اگر کوئی چیز مانگ بیٹھیں تو ماں باپ غصّے سے ڈانٹ دیتے تھے۔ مجھے تو جب بھی ڈانٹ پڑتی تھی تو یہ بھی کہا جاتا تھا کہ تیرا پیٹ بھریں یا تجھے ڈولی میں بٹھانے کی فکر کریں یا تیرے نخرے پورے کریں۔

ان طعنوں نے میرا دل مردہ کر دیا تھا اور میں اپنے آپ کو اس گھر پر اور اس زمین پر بوجھ سمجھنے لگی تھی۔

میں جب بڑی ہوئی تو یہ وہم یقین کی صورت اختیار کر گیا کہ میں پیار اور محبت کے قابل نہیں حالانکہ میری شکل بُری نہیں تھی نہ میرا جسم بھدا تھا۔ مجھ میں یہ خرابی ضرور تھی کہ میں ناز نخرے نہیں کرتی تھی، نہ بن ٹھن کر شوخیاں کرنی آتی تھیں۔ میں بدھو اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ خاوند جب مجھ سے محبت سے پیش آتا تھا تو مجھے وہم ہوتا تھا کہ وہ طنز یا مذاق کر رہا ہے۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتا تھا کہ ہلکا ہلکا میک اپ کر لیا کرو۔ تمہارے پاس اتنے اچھے کپڑے ہیں وہ پہنا کرو۔

مَیں سمجھتی تھی کہ وہ باہر طرح طرح کی لڑکیوں کو دیکھتا رہتا ہے اس لیے چاہتا ہے کہ مَیں بھی انہی لڑکیوں کی طرح فیشن اور چوچلے کروں، مگر میرا دل مُردہ تھا۔ مَیں گھر کے کام کاج کے لیے چُپ چاپ زندگی گزارنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ ہر وقت باورچی خانے اور جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی تھی۔ اکثر اوقات جی میں آتی تھی کہ خاوند مجھے جس طرح چاہتا ہے اس سے بڑھ کر اس کا دل بہلانے کا اہتمام کروں لیکن میرا دل تو جیسے پنجرے میں بند تھا اور ایسا جکڑا ہُوا تھا کہ سُرخی پاوڈر بیکار چیزیں لگتی تھیں اور کھُل کر ہنسنا تو مجھے آتا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی خاوند کا پیار بڑھتا ہی گیا، کم نہیں ہُوا۔

ازدواجی زندگی کا دُوسرا سال شروع تھا کہ ایک روز مجھے خاوند شالامار باغ لے گیا۔ ہم آموں کے درختوں کے نیچے ٹہل رہے تھے۔ مَیں نے ایک جوان لڑکی کو دیکھا۔ ایک درخت کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی۔ کپڑے بہت اچھے تھے۔ بال گالوں پر آتے ہوئے بھلے لگ رہے تھے۔

اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ پہلے تو وہ سنجیدگی سے دیکھتی رہی پھر مُسکرانے لگی اور اچانک وہ تیز تیز چلتی ہماری طرف آئی۔ اُس نے میرے خاوند سے کہا — "ہیلو ڈیئر! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" — اُس نے میرے خاوند کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ اُس کے کندھے پر مار کر کہا — "جھُوٹے وعدے نہ کیا کرو۔"

مجھے چکر آ گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ میرے خاوند کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ کبھی اُسے اور کبھی مجھے دیکھتا تھا۔ اُس کی زبان بند ہو چکی تھی۔ اس لڑکی نے میری طرف دیکھ کر اس سے پوچھا۔ "یہ کِسے ساتھ لیے پھرتے ہو؟"

میرے خاوند نے ہکلا کر کہا — "میری بیوی ہے" — پھر گھبرائے ہوئے

لہجے میں اسے کہا — "آپ کو غلطی لگی ہے۔ مَیں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔"

لڑکی نے قہقہہ لگا کر کہا — "اب تم مجھے کیوں پہچانو گے" — پھر وہ بالکل سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے میرے خاوند کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پرے ہٹ کر مجھے اس طرح گھورنے لگی جیسے مجھے کھا جائے گی۔

میرا خاوند مجھے یہ کہہ کر کہ آؤ چلیں، آگے کو چل پڑا۔ اس لڑکی نے اُسے کہا — "میرا دل زخمی کر کے تم سُکھی نہیں رہو گے" — یہ کہہ کر وہ [illegible] تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی۔

مجھ پر ایسی خاموشی طاری ہو گئی جیسے زبان کاٹ دی گئی ہو۔ میرا خاوند بار بار مجھے دیکھتا تھا اور مجھے یقین دلاتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتا۔ وہ حیران اور پریشان تھا مگر مَیں کس طرح یقین کر لیتی کہ وہ اس لڑکی کو نہیں جانتا اور وہ اسے نہیں جانتی۔ کوئی مرد کسی مرد کے ساتھ اس طرح کا مذاق کر سکتا ہے لیکن کوئی جوان لڑکی کسی ایسے مرد کے ساتھ ایسا مذاق نہیں کر سکتی جسے وہ جانتی ہی نہ ہو، نہ اسے ایسی غلطی لگ سکتی ہے کہ جس کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں اس کی شکل ہی بھُول کر کسی اور آدمی کو اپنا چاہنے والا سمجھ لے۔

خاوند نے جب مجھے بالکل ہی چُپ دیکھا تو قسمیں کھانے لگا لیکن وہ سب جھُوٹی قسمیں تھیں۔ وہ مجھے اتنا بُدھو سمجھ رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہُوا ہے اسے نظر کا دھوکا سمجھ لوں۔ بالکل ثابت ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کے تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ لڑکی اسے اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔ ایسی بے باکی اور بے حیائی، گہرے اور لمبے عرصے کے تعلقات کے بغیر تو نہیں ہو سکتی۔

خاوند مجھے یقین دلاتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ میری خاموشی زیادہ سخت ہوتی گئی۔ چلتے چلتے میری آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا اس طرح گزر گیا جس طرح سورج کے سامنے سے سیاہ بادل کا ٹکڑا گزر جاتا ہے۔ کسی چیز نے میری گردن کو دبا لیا اور حلق کے اندر کوئی چیز پھنس گئی۔ دماغ سے سارے خیال نکل گئے۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ کھوپڑی بالکل خالی ہو گئی ہے۔ پاؤں زمین پر پڑتا تھا تو کھوپڑی کے اندر دھک دھک کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ جسم میں خون کی بجائے ہوا بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کبھی ایسے محسوس ہوتا جیسے آسمان نیچے آ رہا ہے اور میں زمین میں اُترتی جا رہی ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ ہم تانگے میں بیٹھے تو سارا راستہ میرا خاوند بولتا رہا مگر مجھے اس کے الفاظ یاد نہیں۔ وہ مجھے یقین دلاتا رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتا۔ میں سمجھ بوجھ کی حد سے دُور نکل گئی تھی۔ میرا دماغ جو بالکل خالی ہو گیا تھا یکلخت سوچوں سے بھر گیا۔ یہ سوچیں دھاگے کے گچھے کی طرح اُلجھی ہوئی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ سوچیں سیدھی ہونے لگیں۔ مجھے بچپن یاد آ گیا اور یادیں مجھے شالامار باغ تک لے آئیں۔ اتنی عمر کا کوئی ایک بھی لمحہ ایسا یاد نہ آیا جب مجھے کسی نے محبت سے بلایا ہو یا جب کبھی میں نے خوشی کا ذائقہ چکھا ہو کہ مسرّت کیسی ہوتی ہے۔

خاوند سے جو محبت ملی تھی وہ دھوکا ثابت ہوئی۔ خاوند کی اس فریبی محبت سے میں یہی سمجھی کہ عورت کو خدا نے مرد کے لیے عیاشی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس خیال سے میرا خون جوش میں آ گیا اور دل میں یہ احتجاج آیا کہ تانگے سے چھلانگ لگا دوں اور خاوند سے یہ کہہ کر بھاگ جاؤں کہ میرا جسم کسی ایسے آدمی کی عیاشی کا ذریعہ نہیں بنے گا جو لڑکیوں کو دھوکا دیتا پھرتا ہے مگر میرے اندر سے کسی چیز نے درندوں کی طرح

میرا دل پنجے میں پکڑ لیا۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ بے بسی اور بزدلی نے مجھے تڑپا دیا لیکن میں تڑپنے سے بھی ڈرتی تھی۔

بعد میں گھر والے مجھے پاگل سمجھنے لگے تھے۔ میں بالکل پاگل نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ پاگل جب ٹھیک ہو جاتے ہیں تو انہیں پچھلی کوئی بات یاد نہیں رہتی اور پاگل پن میں وہ جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں اس کا انہیں کوئی احساس نہیں ہوتا لیکن میرا ہوش ٹھکانے تھا۔ مجھے اپنی ہر ایک حرکت اور ہر ایک بات کا احساس تھا۔ کبھی کبھی ایسے وہم ہوتا تھا کہ میرے اندر شریر یا کوئی بدرُوح داخل ہو گئی ہے جو مجھے کوئی صحیح بات نہیں کرنے دیتی۔ لیکن میں بات تو کرتی ہی نہیں تھی۔ خاموش رہتی تھی۔

دل میں باتیں بہت ساری آتی تھیں۔ میں خاوند کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی ماں کو بھی بہت ساری باتیں کہنا چاہتی تھی۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ کرنے والی باتوں سے سینہ بھرا رہتا تھا مگر بولنے کی کوشش کرتی تھی تو میرے اندر کی بدرُوح میرا گلا دبا لیتی تھی۔ مجھے رونا بالکل نہیں آتا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی ذرا سی نمی بھی نہیں آتی تھی۔

مجھے اب وہ وقت یاد آتا ہے جب میں تانگے سے اُتر کر خاوند کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی تو وہ خواب لگتا ہے۔ گھر میں داخل ہوئی تو مجھے گھر کے لوگ اور ساری چیزیں خواب لگ رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اپنے کمرے میں داخل ہونے لگی تو دہلیز سے ایسی ٹھوکر کھائی کہ میں منہ کے بل گر پڑی۔ مجھے خاوند نے اُٹھایا تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آیا اور بادل کے سائے کی طرح گزر گیا۔

اگر میں پاگل ہوتی تو مجھے یہ باتیں یاد نہ ہوتیں۔ پھر میں پاگل تو نہیں تھی۔ میری

حرکتیں پاگلوں والی سرزد ہوتیں۔ پھر جُوں جُوں دن گزرنے لگے میری حالت بگڑتی گئی۔ خاوند ایک ہی بات دُہراتا رہتا تھا کہ اس لڑکی کو وہ بالکل نہیں جانتا۔ بعض دفعہ اس کے آنسو نکل آتے تھے لیکن میرے دل میں بچپن سے جو محرومیاں اور گھٹن بھری ہُوئی تھی وہ مجھے خاوند کے خلاف گمراہ کرتی رہتی تھی۔ مَیں خاوند کے مُنہ سے صرف یہ کلمے سُننا چاہتی تھی ـــ "مجھے تمہارے ساتھ صرف جسمانی تعلقات رکھنے کے لیے بیاہا گیا ہے۔ مَیں محبت اس لڑکی کے ساتھ کرتا ہوں جو مجھے شالامار باغ میں ملی تھی۔"

میرا دماغ اس کے سوا اور کوئی بات قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے آپ پر غصّہ آجاتا تھا کہ خاوند کی اس خواہش کو مَیں نے کبھی بھی پورا نہ کیا تھا کہ میک اَپ کیا کروں اور اچھے کپڑے پہنا کروں۔ خاوند باہر جا کر جس طرح کی لڑکیوں کو دیکھتے ہیں اپنی بیویوں کو بھی اسی طرح دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر بیویاں ان کی یہ خواہش پوری نہ کریں تو ان کا دھیان گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔

مَیں نے کوشش کی تھی کہ باہر پھرنے والی بے پردہ لڑکیوں کی طرح فیشن کروں مگر دل نہیں مانتا تھا اور اس پنجرے سے باہر نہیں آتا تھا جس میں اسے میرے ماں باپ کی تنگدستی اور میرے جہیز کے لیے کنجوسی نے بند کیا تھا۔ وہ بے چارے مجبور تھے۔ جہیز نہ ہوتا تو مجھے کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہا نہ جا سکتا۔ میری کوئی قیمت نہ ہوتی۔ والدین نے اپنی اور بچّوں کی فرمائشیں اور خوشیاں جہیز پر قربان کر دیں۔ پھر بھی میری قسمت نہ بدل سکی۔

مَیں ہر وقت چپ رہنے لگی اور اسی حالت میں گھر کا کام کرتی رہی۔ پہلے اتنا زیادہ کام کرنے سے جو خوشی ہوتی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اب میں مشین کی طرح

کام کرتی تھی۔ کام کے دوران اندھیرا سایہ میری آنکھوں کے سامنے سے کئی بار گزرتا تھا پھر تھوڑی دیر تک میرے ہاتھ کانپتے رہتے تھے۔ اس حالت میں میرے ہاتھ سے برتن ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ ایک بار پکی پکائی ہانڈی چمچہ ہلاتے چولہے سے گری اور اُلٹ گئی۔ ساس نے ایسی بُری بُری باتیں سُنائیں جو کوئی شریف لڑکی برداشت نہیں کر سکتی۔ مَیں نے یہ زہر بھی اپنے دل میں ڈال لیا۔

خاوند جب دفتر چلا جاتا تھا تو میری حالت زیادہ بگڑ جاتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تصویریں چلنے لگتی تھیں جن میں صرف یہ نظر آتا تھا کہ میرا خاوند اُس لڑکی کے ساتھ شالامار باغ میں بیٹھا ہے اور اُس کے ساتھ وہی حرکتیں کر رہا ہے جو میرے ساتھ کیا کرتا ہے اور اس کی بیوی مَیں نہیں، وہ لڑکی ہے۔ دونوں ہنستے کھیلتے تھے اور مَیں یہ تصویریں گھر کی دیواروں پر دیکھتی رہتی تھی۔ رات کے وقت خاوند جب میرے قریب ہوتا تھا تو میرے ساتھ وہی باتیں اور حرکتیں کرتا تھا جو مَیں ذہن کے پردے پر چلنے والی تصویروں میں دیکھتی رہتی تھی۔ اس سے میرا دل جلتا تھا اور مَیں کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ایک بدرُوح مجھے جکڑ کر خاوند کے آگے پھینک دیتی تھی۔ مَیں ہِل جُل نہیں سکتی تھی۔

ایک مہینے کے دوران میرے ہاتھ سے بہت سے برتن ٹوٹ گئے۔ ایک بار ہانڈی اُلٹ گئی اور ایک بار دو سیر دُودھ دیگچہ گرنے سے بہہ گیا۔ میری ظاہری حالت ایسی تھی جیسے مَیں بالکل ٹھیک ہُوں اور جو کچھ مجھ سے ہو رہا ہے وہ جان بُوجھ کر کر رہی ہُوں۔ میرے ماں باپ غریب اور مرے سے لوگ تھے۔ میری ساس نے انہیں گھر جا کر بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور یہ الزام جڑ دیا کہ تمہاری لڑکی کا دل

کسی اور جگہ ہے اس لیے وہ ہمارے گھر کے برتن توڑتی ہے۔

میری ماں مجھے گھر لے گئی اور بجائے پیار سے بات کرنے کے یا مجھ سے کچھ پُوچھنے کے جو گند اُس کے منہ میں آیا وہ اُس نے مجھے کہہ ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میرا جسم اکڑنے لگا۔ میرے اندر جو بدرُوح تھی اس نے میرے ہاتھ مروڑ کر اُلٹی طرف کر دیئے، پاؤں بھی اسی طرح مُڑ گئے اور سارا جسم اکڑ کر کانپنے لگا۔ اس کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اندھیرا کتنی دیر رہا اور اس کے دوران کیا ہُوا۔

والد صاحب مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے مجھے گولیاں دیں۔ پہلی گولی کھاتے ہی مجھے نیند آگئی۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹوں بعد والد صاحب نے جگایا اور ایک اور گولی کھلا دی۔ میں پھر سو گئی۔ پھر خواب کی طرح لگا کہ والد صاحب مجھے ایک اور گولی کھلا رہے ہیں۔ میں گہری نیند سوئی رہی۔ اس دوران گولیاں میرے مُنہ میں ڈالتے رہے اور میں نیند کی بڑی ہی پیاری دُنیا میں گُم ہو گئی۔ مجھے بازو میں شدید چُبھن ہوئی تو میں بیدار ہو گئی۔ میرے بازو میں انجکشن کی سُوئی اُتری ہوئی تھی اور میں ڈاکٹر کی دکان میں تھی۔

بہت دنوں بعد نیند کا خمار اُترا یا شاید اُتار اگیا مگر میں اَب پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ دماغ پہلے سے زیادہ بیکار ہو چکا تھا۔ مجھ میں تبدیلی یہ آئی کہ میں نے بولنا شروع کر دیا۔ خاموشی ٹوٹ گئی۔ میں جو باتیں کہتی تھی وہ لفظ لفظ یاد ہیں۔ میں ہر ایک بات ہوش میں کہتی تھی مگر میری ہر بات میں شکوے اور شکایتیں اور طعنے ہوتے تھے یا اُداسی سے بھری ہوئی باتیں کہتی تھی۔

تھوڑے دن اور گزرے تو میرے رُکے ہوئے آنسو بہنے لگے۔ پھر یہ حالت

ہو گئی کہ میں روتی تھی یا بولتی تھی۔ کوئی پاس نہ ہو تو میں بڑبڑاتی رہتی تھی۔ اتنی زیادہ بک بک اور جھک جھک کرنے کے باوجود میرے منہ سے یہ کبھی نہ نکلا کہ میرا خاوند کسی اور لڑکی کے جال میں پھنسا ہُوا ہے۔

سُسرال والے مجھے اپنے گھر لے گئے تو میں نے ساس، سُسر اور نندوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے شروع کر دیئے۔ وہ سیدھی بات کہتی تھیں تو میں اُلٹا جواب دیتی تھی۔ جب میں چُپ ہوتی تھی تو رونے لگتی تھی۔ سُسرال والوں نے میرا علاج شروع کرا دیا۔ پہلے ایک ڈاکٹر، پھر دُوسرا، پھر تین حکیموں نے باری باری علاج کیا مگر بدرُوح نے کوئی بھی علاج کامیاب نہ ہونے دیا۔ میرے اندر جو بھی دوائی جاتی تھی وہ بدرُوح کھا جاتی تھی۔

مجھے تین چار بار جسم کے اکڑنے کے دَورے پڑے، پھر رُک گئے۔ اس کے بعد ایک اور تبدیلی آئی۔ ایک روز میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ میری نظر اپنے کانوں سے لٹکتے ہوئے کانٹوں پر پڑی۔ میں نے دونوں کانٹے اتار لیے اور ساس کو دکھا کر کہا ــــ "یہ میرے کانوں میں کیوں لٹکا دیئے تھے؟ یہ تو ناز نخرے کرنے والی لڑکیوں کے لیے ہوتے ہیں۔ میں تو مٹی کا بُت ہُوں" ــــ میں نے صحن میں جا کر کانٹے کوٹھے پر پھینک دیئے۔

ساس مجھے کوستی ہوئی کوٹھے پر چلی گئی۔ میں نے اپنے زیورات میں سے اپنے ماں باپ کی دی ہوئی چیزیں نکالیں جن میں ایک ہار، سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں تھیں اور میں باہر نکل گئی۔ میں اپنی نندوں سے یہ کہہ کر باہر نکلی کہ اپنے گھر کے کوٹھے پر پھینکنے جا رہی ہوں۔ میں نے بُرقعے کے بغیر باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ ہمارے

ہاں پردے کی سخت پابندی تھی۔ لیکن میں اس حالت میں باہر نکل گئی کہ برقعہ تو درکنار سر پہ دوپٹہ بھی نہیں تھا۔ میری نندیں جلدی جلدی برقعے پہن کر میرے پیچھے بھاگیں اور گلی میں مجھے جا پکڑا۔ میرے سُسر گھر نہیں تھے نہ کوئی اور مرد تھا۔ میں نے نندوں سے دھینگا مُشتی شروع کر دی اور زیورات گلی میں پھینک دیئے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ عورتیں مجھے پکڑ کر گھر لے آئیں۔

ایسی حرکتوں کو کون برداشت کر سکتا تھا۔ گھر اور باہر والے مجھے پاگل کہنے لگے لیکن میں اپنے آپ کو پاگل نہیں سمجھتی تھی۔ اس واقعہ کے بعد محلے کی عورتیں ہمارے گھر آنے لگیں۔ جو عورت آتی تھی ایک دو نسخے یا ایک دو خانقاہوں یا عاملوں یا پیروں کے پتے بتا جاتی تھی۔ ان عورتوں نے متفقہ فیصلہ دے دیا کہ اس لڑکی پر آسیب ہے۔

مجھے دو عاملوں کے پاس لے جایا گیا۔ ایک نے بتایا کہ مجھ پر ایک مُشرک جن کا قبضہ ہے جسے نکالنا بہت مشکل ہے۔ یہ تو بوڑھا سا آدمی تھا جس نے مجھے تعویذ لکھ دیئے۔ پھر مجھے ایک پیر کے پاس لے گئے۔ میں اس بدبخت کا اتا پتا نہیں بتانا چاہتی۔ کوئی بھی نہیں مانے گا کہ وہ بدکار آدمی ہے۔

میں ہمیشہ سوچتی رہتی ہوں کہ اس بدکار پیر کے پاس زیادہ تر عورتیں جاتی ہیں۔ میں نے نوجوان لڑکیوں کو بھی اس کے پاس جاتے دیکھا ہے۔ میری کہانی پڑھ کر سوچیں کہ وہ کونسا جن تھا جو مجھ میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ سب عورتوں کی سُنی سنائی باتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

میں نے گھر آکر اس پیر کو کوسنا شروع کر دیا۔ یہ ایسا گناہ تھا جو معاف نہیں کیا جاتا۔ اب تو میرے پاگل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ ایسے برگزیدہ پیر کو کوئی پاگل ہی

بُرا بھلا کہہ سکتا ہے۔ پیروں فقیروں کو ماننے والی مخلوق نے فیصلہ دے دیا کہ اب اس لڑکی کا علاج پاگل خانے کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ میرا خاوند بھی تنگ آکر مجھ سے کھچا کھچا رہنے لگا۔

میری یہ حالت دو سال رہی۔ آخر ایک روز مجھے میرا سُسر اور خاوند تانگے میں یہ کہہ کر بٹھا لے گئے کہ ایک بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔ تانگہ پاگل خانے کے سامنے جا رکا۔ میں شادی سے پہلے اِدھر سے دو بار گذری تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ پاگل خانہ ہے۔ اس کے اندر کی دُنیا کی میں نے بہت ہی ڈراؤنی اور بھیانک باتیں سُنی تھیں۔ اِس بلڈنگ کو دیکھ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

جب مجھے اُترنے کے لیے کہا گیا تو میں نے چیخیں مارنی شروع کر دیں جس سے تماشائیوں پر ثابت ہو گیا کہ میں پاگل ہوں۔ سُسر اور خاوند نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تماشائی اکٹھے ہو گئے۔ میں نے برقعہ اتار کر پھینک دیا اور تماشائیوں سے چیخ چیخ کر کہنا شروع کر دیا — "دیکھ لو مجھے۔ اچھی طرح دیکھ لو" اور میں واہی تباہی بکنے لگی۔

مجھے گھسیٹ کر اندر لے گئے۔ میرے ساتھ پاگلوں کا سا سلوک کیا گیا۔ بہت دیر بعد ایک معمّر ڈاکٹر کے کمرے میں مجھے داخل کر دیا گیا۔ اس نے میرے سُسر اور خاوند کو باہر نکال دیا۔ وہ ڈاکٹر نہیں اللہ کا فرشتہ تھا۔ اس نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا — "بیٹی! تمہارے دل میں جو کچھ ہے میرے سامنے نکال کر رکھ دو۔ کون کہتا ہے تم پاگل ہو۔ میں اپنی بیٹی کو یہاں داخل نہیں کروں گا۔"

میں نرم پڑ گئی اور جو کچھ محسوس کر رہی تھی اسے بتا دیا۔ اُس نے میرے ساتھ

بڑی اچھی اچھی باتیں کیں جن سے میں اُسے اپنا مشفق باپ اور دوست سمجھنے لگی۔
اُس نے میرے سُسر اور خاوند کو بلا کر کہا کہ اسے داخل نہیں کیا جائے گا۔ کل پھر لانا۔
مجھے باہر بھیج کر وہ ان دونوں کے ساتھ معلوم نہیں کیا کیا باتیں کرتا رہا۔

دوسرے دن مجھے اکیلا خاوند ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے تنہائی میں بٹھا کر کہا کہ بچپن کی پرانی سے پرانی جو بات یاد ہو وہاں سے بات شروع کرو اور بولتی چلی جاؤ۔ میں نے دماغ پر زور دے کر چار پانچ سال کی عمر سے یادوں کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ غور سے سُنتا رہا اور کچھ لکھتا بھی رہا۔ میں اپنے آپ میں یہ تبدیلی محسوس کرنے لگی کہ سینے میں جو تلخی بھری ہوئی تھی وہ کم ہو گئی۔ بہت دیر گزر گئی تو میری بات ختم ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر کو بھی نہ بتایا کہ میرے خاوند کے تعلقات ایک اور لڑکی کے ساتھ ہیں۔ میں یہ بات کسی کو نہیں بتاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جب اس منظر کو یاد کرتی تھی تو میرا دل ڈوب جاتا تھا اور غصے سے میرا جسم کانپنے لگتا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ کسی وقت ڈاکٹر کو یہ بات بتا دوں گی۔ ڈاکٹر نے اگلے روز پھر بلایا۔

میں بڑی خوشی سے گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ پاگل خانے کے ڈاکٹر ہر مریض کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں یا یہ کوئی فرشتہ سیرت ڈاکٹر تھا جسے مجھ پر رحم آ گیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔

میں ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ خاوند ساتھ نہیں گیا تھا۔ سُسر ساتھ تھا۔ اسے ڈاکٹر نے باہر بھیج دیا تھا۔ ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ ابھی اس نے کوئی بات شروع نہیں کی تھی کہ ایک نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ "ڈاکٹر صاحب!" اس لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ میری شادی پہ آئیں گے نا؟ وہ مان گئے ہیں۔

ساری رات میرے پاس بیٹھے رہے ہیں"۔

"شادی کب ہو رہی ہے؟" ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔

"پرسوں... بارات گیارہ بجے آئے گی"۔ لڑکی نے جواب دیا۔ "میرے ابّا جان نے سکوٹر خرید لیا ہے"۔

میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو میرا خون رگوں میں اُبلنے لگا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو میرے خاوند کو شالا مار باغ میں ملی تھی۔ میرے سینے میں یکلخت آگ بھڑک اُٹھی۔ قریب تھا کہ میں جھپٹ کر اس کی گردن دبا لیتی اور اسے ختم کر کے چھوڑتی۔ اسی ڈائن نے مجھے پاگل خانے تک پہنچایا تھا۔

اتنے میں ایک آدمی کمرے میں آیا۔ اس نے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر کہا —— "چلو باہر"۔

ڈاکٹر نے اسے ڈانٹ کر کہا —— "تم لوگ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے ہو میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ اسے یہاں آنے سے مت روکا کرو"۔

وہ آدمی باہر چلا گیا۔ چند منٹوں بعد لڑکی بھی چلی گئی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کہاں رہتی ہے؟ آپ کو کس طرح جانتی ہے؟"

"یہ ہماری سوسائٹی کا بہت ہی دردناک ڈرامہ ہے"۔ ڈاکٹر نے آہ بھر کر کہا۔ "اسے پاگل خانے میں آئے دو سال ہو گئے ہیں۔ ہر روز مجھے بتانے آتی ہے کہ اس کی شادی پرسوں ہو رہی ہے اور اس کے ابّا جان نے سکوٹر خرید لیا ہے"۔

"تو یہ پاگل ہے؟"

"ہاں بیٹی! اس بے چاری کو پاگل کہ لو" ـــــ ڈاکٹر نے جواب دیا ـــــ "پاگل تو ہماری سوسائٹی ہے جس میں ایک لڑکی اس لیے پاگل ہو گئی ہے کہ اس کا باپ اس کے جہیز میں سکوٹر نہیں دے سکتا تھا"۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے بے صبر ہو کر کہا ـــــ "مجھے اس لڑکی کے متعلق ساری بات بتائیے۔ مجھے اسی لڑکی نے پاگل بنایا ہے۔ میں نے آپ کو ابھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔ میرا دراصل روگ یہی ہے کہ میرے خاوند کے تعلقات اس لڑکی کے ساتھ ہیں"۔

میں نے ڈاکٹر کو شالامار باغ کا واقعہ سُنا دیا۔

ڈاکٹر مسکرایا مگر یہ مسکراہٹ خوشی کی نہیں تھی۔ اس نے کہا "پھر مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں نے تمہیں داخل نہیں کر لیا تھا۔ اس لڑکی کی بپتا یہ ہے کہ اس کی منگنی اپنے چچا زاد کے ساتھ ہو گئی تھی۔ دونوں کُنبے آمنے سامنے رہتے ہیں۔ یہ لڑکی اور لڑکا بچپن سے اکٹھے رہے تھے اس لیے ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ لڑکے کا کنبہ لڑکی والوں کی نسبت امیر تھا اور ان کا رہن سہن ذرا نئی طرز کا تھا۔ لڑکی کے والدین کی آمدنی معمولی تھی اس لیے پرانی طرز کی زندگی بسر کرتے تھے.....

"لڑکی خوش تھی کہ وہ جسے چاہتی تھی اسی کے ساتھ بیاہی جا رہی تھی۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ منگنی ہو جانے کے باوجود چوری چُھپے ملتے تھے۔ شادی کا دن ابھی مقرر نہیں ہُوا تھا۔ اچانک لڑکے کا رویّہ بدل گیا۔ اس نے لڑکی سے ملنا ترک کر دیا۔ پھر لڑکے کے والدین کا رویّہ بھی بدل گیا اور انہوں نے لڑکی میں اور اس کے گھرانے میں نقص نکالنے شروع کر دیئے۔ پھر ایک روز انہوں نے کسی کی زبانی لڑکی کے باپ کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کی لڑکی کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ نقص یہ بتایا کہ لڑکی کے متعلق باہر

سے بہت بُری رپورٹیں ملی ہیں۔ لڑکی کا چال چلن اچھا نہیں....

"لڑکی کے والدین نے لڑکی کو باہر جانے سے روک دیا۔ لڑکی رو رو کر بے حال ہونے لگی۔ اس نے لڑکے سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر لڑکے نے ملنے سے انکار کر دیا۔ لڑکی کا دماغ تو اسی سے خراب ہونا شروع ہو گیا۔ ایک تو اس کی محبّت کچلی گئی اور دوسرے یہ ظلم کہ اس پر بدچلنی کا الزام لگایا گیا...

"لوگ ہر طرف کی خبر رکھتے ہیں۔ انہیں پتہ چل گیا کہ منگنی کیوں توڑی گئی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ایک اور خاندان اپنی لڑکی اس لڑکے کو دینا چاہتا تھا۔ پہلے تو لڑکے نے انکار کر دیا۔ لڑکی والوں نے جہیز میں کشش پیدا کر دی اور کہا کہ وہ لڑکی کو جہیز میں سکوٹر دیں گے۔ یہ ایسی کشش تھی کہ لڑکا پھسل گیا"

یہ آج سے سولہ سترہ سال پہلے کا واقعہ ہے جب یہاں سکوٹر نئے نئے آئے تھے اور کسی کسی کے پاس سکوٹر ہوتا تھا۔ باہر سے سکوٹر کم آتے تھے جو امیر کبیر لوگ خرید لیے جاتے تھے، ان کی ابھی اتنی زیادہ بھرمار نہیں تھی جتنی آج ہے۔

ڈاکٹر نے اس لڑکی کے کیس کی ہسٹری سُناتے ہوئے کہا ـــ "لوگوں نے اس لڑکی کے والدین کو بتا دیا کہ لڑکا اور اس کے والدین سکوٹر کی خاطر وعدے سے پھر گئے ہیں۔ لڑکی نے لڑکے کو رقعہ لکھ کر بھیجا جس میں لکھا کہ ایک سکوٹر کی خاطر میرا سُہاگ نہ اُجاڑو۔ بچپن کی محبت کو سکوٹر پر قربان نہ کرو۔ میں تعلیم یافتہ ہُوں۔ شادی کر کے نوکری کروں گی۔ تم گھر کا خرچ پُورا کرنا۔ میں ساری تنخواہ بچا کر تمہیں سکوٹر لے دُوں گی....

"لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ لڑکی نے اپنی ماں سے کہا کہ کہیں سے قرض لے کر سکوٹر خرید لیں مگر یہ ان کے بس سے باہر تھا۔ وہ پہلے ہی مقروض ہو چکے تھے...

"لڑکی کی قسمت میں پاگل ہو جانا ہی لکھا تھا۔ ایک روز اُس کے گھر کے سامنے والے گھر میں شادی کا شور شرابا شروع ہو گیا۔ چار پانچ راتیں لڑکیاں گاتی بجاتی رہیں۔ پھر بینڈ باجے کے ساتھ بارات گئی اور شام کے وقت دُلہن کار میں آئی۔ گلی میں جب ٹرک سے جہیز اُترا تو اس میں سکوٹر بھی تھا۔ اس لڑکی کا بُرا حشر ہوتا رہا۔ کمرہ بند کر کے روتی رہی۔ پھر ہر صبح اسے اپنے دروازے کے سامنے سکوٹر سٹارٹ ہونے کی آواز آتی جو تیروں کی طرح اس کے سینے سے پار ہو جاتی۔ لڑکی کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کا گھر لڑکے کے گھر کے بالکل سامنے ہے۔ لڑکی پہلے تو روتی رہتی تھی پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ہنستے ہنستے چُپ ہو جاتی اور ہوا میں اس طرح دیکھنے لگتی جیسے اُڑتے ہوائی جہاز کو دیکھتے ہیں۔ پھر اس نے باہر جانا شروع کر دیا....

"ایک روز ایک نوجوان دُولہا اور دلہن اسے تانگے میں اپنے ساتھ بٹھائے اس کے گھر لائے اور اس کے باپ کو بتایا کہ وہ دونوں باغِ جناح میں سیر کر رہے تھے کہ اس لڑکی نے آگے ہو کر دُولہا کا ہاتھ پکڑ کر بے تکلّفی سے کہا ___ 'ہیلو ڈیئر! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ جھوٹے وعدے نہ کیا کرو' ___ دُولہا پریشان ہو گیا۔ دُلہن کی پریشانی کو تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ دُولہا عقلمند تھا۔ اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس لڑکی کیساتھ بے تکلّفی کی باتیں کرتے کرتے اسے راضی کر لیا کہ وہ اس کے گھر چلے گا۔ لڑکی اسے گھر لے آئی جہاں دُولہا نے اپنی دُلہن کے سامنے لڑکی کے باپ کو بتایا کہ لڑکی نے کیا حرکت کی ہے۔ باپ بے چارے کے آنسو نکل آئے۔ اس نے دولہا کو بتایا کہ لڑکی کا دماغ خراب ہو گیا ہے...

"دس بارہ روز بعد ایک معزّز آدمی لڑکی کو گھر لایا۔ اس نے لڑکی کے باپ کو بتایا کہ مال روڈ پر اس لڑکی نے ایک جوان سے میاں بیوی کی لڑائی کرا دی ہے۔ اس نے

بیوی کے سامنے اس کے خاوند کو پکڑ لیا اور کہنے لگی ___ 'ہیلو ڈیئر! کہاں غائب ہو گئے تھے؟' ___ بیوی اپنے شوہر پر برس پڑی کہ اس کی اس لڑکی کے ساتھ بے تکلّفی ہے۔ مال روڈ پر تماشا بن گیا۔ اس لڑکی نے اس کے بعد جو حرکتیں کیں ان سے شک ہوتا تھا کہ اسے کوئی دماغی خرابی ہے۔ چنانچہ یہ معزّز آدمی اسے بہلا پھسلا کر اس گھر لے آیا.... ایک مہینے بعد پولیس اس لڑکی کو گھر لائی اور اس کے باپ کو بتایا کہ اگر مرد پاگل ہو کر ننگا پھرے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ نوجوان لڑکی ہے۔ اسے گھر میں بند رکھو یا مینٹل ہسپتال داخل کرا دو۔ شہر میں بڑے بڑے ذلیل لوگ موجود ہیں۔ کوئی لڑکی کو خراب نہ کر دے۔ باپ بے چارہ لڑکی کو یہاں لے آیا اور اس نے رو رو کر بتایا کہ لڑکی کا پاگل پن کیا ہے۔ ہم نے اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی لیکن دماغ کی حالت سُدھر گئی تو اس نے اپنے چچا زاد کو ڈھونڈنا شروع کر دیا....

"اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ میں اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہوں اس لیے میرے ساتھ اسی طرح باتیں کرتی ہے جس طرح ابھی ابھی کر کے گئی ہے۔ کسی کو پریشان نہیں کرتی۔ اکیلے باتیں کرتی رہتی ہے۔ میں نے اس کی باتیں سُنی ہیں اس طرح باتیں کرتی ہے جیسے اس کا چچا زاد سامنے بیٹھا ہُوا ہے۔ کوئی شکایت نہیں کرتی۔ ایک روز ایک پودے کے پاس بیٹھ کر باتیں کر رہی تھی۔ پودے کے پھول کو چھو چھو کر کہہ رہی تھی ___ 'تمہاری آنکھیں کتنی پیاری ہیں۔ تم پھول کی طرح خوبصورت ہو۔ میرے ابّا جان نے تمہارے لیے سکوٹر خرید لیا ہے۔ میں نوکری کروں گی۔ ساری تنخواہ بنک میں جمع کرا دیا کروں گی پھر تمہیں بڑی پیاری سی کار لے دوں گی' ___ اس کے بعد اس نے ہر روز مجھے یہ خوشخبری سُنانی شروع کر دی کہ اس کی

شادی پرسوں ہو رہی ہے - ابّا جان نے سکوٹر خرید لیا ہے"۔

"آپ اس کا علاج کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا -

"نہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اس کے روگ کا علاج یہی ہے جو اس نے خود ہی کر لیا ہے۔ یہ اب ایسی جنت میں آباد ہے جہاں ہر روز اسے اس کا منگیتر ملتا ہے - یہ اس سے پیار کی باتیں کرتی ہے۔ ہر روز اس کے ابّا جان سکوٹر خرید لیتے ہیں اور یہ خیالوں میں شادی کی تیاریوں میں مگن رہتی ہے - ہم اسے اس جنّت سے نکال کر اس جہنّم میں واپس نہیں بھیجیں گے جہاں اس سے ایک لڑکی نے ایک سکوٹر دے کر اس کی محبت خرید لی ہے اور جہاں اس کے ماں باپ ساری عمر سکوٹر نہیں خرید سکیں گے"۔

ڈاکٹر نے آہ بھر کر کہا ــــ "پاگل خانے کی چار دیواری میں تو کوئی آتا ہے چار دیواری کے پاگل خانے میں معلوم نہیں کتنی لڑکیاں پاگلوں کی زندگی بسر کر رہی ہیں جن کے والدین اتنے غریب ہیں کہ لڑکیوں کے لیے رشتے خرید نہیں سکتے ... اور میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اس لڑکی نے تمہاری طرح کی کتنی بیویوں کو پاگل کر دیا ہو گا جن کے خاوندوں کو یہ اپنا منگیتر سمجھ کر کہتی تھی کہ تم کہاں غائب ہو گئے تھے، یہی اس کے پاگل پن کی علامت تھی کہ جہاں کسی جواں سال جوڑے کو دیکھتی تھی، آدمی کو اپنا منگیتر سمجھ لیتی تھی"۔

میرے آنسو بہنے لگے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ میں اب ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میں سسر کے ساتھ گھر آ گئی۔ رات کے وقت میں نے اپنے خاوند کے پاؤں پکڑ لیے اور رو رو کر معافی مانگی - میرا دماغ ٹھکانے آ گیا - میرے خاوند کی محبّت سچّی

تھی - مجھے سچّی محبت نے بچا لیا - لیکن میں اکثر اس لڑکی کے متعلق سوچا کرتی ہوں جو چار دیواری کے پاگل خانے سے نکل کر پاگل خانے کی چار دیواری میں محبّت کے بکھرے موتی چنتی رہتی ہے -

☆ ☆

گھر کی چار دیواری سے
مُلک کی چار دیواری تک

مَیں نے ابّا جان کو روکا اور کہا کہ لوگ بدنام کریں گے مگر میں سمجھ گئی کہ ابّا جان نگہت کی خوبصورتی اور اُس کی تیمارداری کے اسیر ہو گئے ہیں۔ نگہت نے میرے ابّا جان جیسے پختہ کردار کے مرد کو اپنا غلام بنا لیا۔

فرزانہ رشید

راولپنڈی سے گاڑی چلنے والی تھی جب وہ میرے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئی اور میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا۔ میرا دھیان اپنے بیٹے کی طرف تھا جو پلیٹ فارم پر کھڑا کھڑکی میں سے میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ وہ اُس وقت کالج کے پہلے سال میں تھا۔ مجھے الوداع کہنے آیا تھا۔ میں دو تین دنوں کے لیے پشاور جا رہی تھی۔ میرے سسرال میں ایک عورت فوت ہو گئی تھی۔

گاڑی چل پڑی تو میرے بیٹے نے ایک بار پھر کہا —— "امّی، جلدی آجانا" ——

بچے بچوں والے ہو جائیں تو بھی ماں کے سامنے بچے ہی بنے رہتے ہیں۔ میں اسے اُس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ مجھے نظر آتا رہا۔ پھر میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔

وہ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں صرف دو اور لڑکیاں تھیں شاید سٹوڈنٹ تھیں اور کراچی سے آ رہی تھیں۔ رش کا کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ یہ سیکنڈ کلاس تھی جسے آجکل فسٹ کلاس کہتے ہیں۔ لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے

بھی باتیں کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ میرے سامنے جو آکے بیٹھی تھی، میری ہم عمر تھی۔ امیر عورت تھی۔ عمر کی نیا دتی کو اس نے سرخی پاؤڈر اور شوخ رنگ کے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ اُس طرف والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے چہرہ کھڑکی سے ہٹا کر میری طرف کیا اور مجھے دیکھا۔ اچانک اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور اس کے فوراً ہی بعد میرے جسم کو سر سے پاؤں تک ایسا جھٹکا لگا جیسے میں نے بجلی کا ننگا تار چھو لیا ہو۔

میں فیصلہ نہ کر سکی کہ اس سے نظریں ہٹا لوں یا اس سے رسمی سی علیک سلیک ہی کر لوں۔ وہ بھی شاید یہی سوچ رہی تھی۔ نظریں نہ وہ مجھ سے ہٹا سکی نہ میں اس سے ہٹا سکی۔ ہم دونوں بیک وقت اُٹھیں۔ پہل اس نے کی اور وہ میرے پاس آ گئی۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے دوسرا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور ہاتھ دبا کر مجھے بٹھا دیا۔ خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں اسے اٹھارہ سال بعد دیکھ رہی تھی۔

وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کا بازو میرے کندھوں پر رہا۔ اس کے کپڑوں سے عطر کی ایسی خوشبو آ رہی تھی جس میں مدہوشی کا اثر تھا مگر اس کے گناہوں کی جو بُو تھی اس نے سمندر پار کے اتنے قیمتی عطر کو بھی بدبُودار بنا رکھا تھا۔ میرے سینے سے ایک شعلہ یہ سوال بن کر اُٹھا ــ "اتنے عرصے میں اور کتنے گھر اجاڑے ہیں؟" ــ لیکن میں نے یہ شعلہ ہونٹوں کے پیچھے روک لیا۔

مجھے اس عورت سے نفرت تھی۔ اٹھارہ سال گزرے جب وہ میرے سہاگ کو ڈنک مار کر غائب ہو گئی تھی تو میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ جہاں کہیں مل گئی، اسے

زندہ نہیں چھوڑوں گی اور اگر اتنی جرأت نہ کر سکی تو اس کا یہ چہرہ جس کی کشش سے وہ دوسریوں کے خاوندوں کو اپنا غلام بنا لیتی ہے، ناخنوں سے چھیل کر مکروہ بنا دوں گی مگر وہ مجھے اٹھارہ سال بعد نظر آئی تو اس کا چہرہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میرے ارادے اور میرے شعلے سرد پڑ گئے۔

"ناراض ہو؟" — اُس نے پُوچھا۔

مَیں زبردستی مسکرائی مگر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اپنے رومال سے میرے آنسو پونچھ کر کہا — "مَیں نے رونا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

"تمہیں دوسروں کو جو رُلانا آتا ہے۔" مَیں نے جلی کٹی آواز میں کہا۔

وہ مسکرائی، اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ مَیں نے اس کی مسکراہٹ میں جو چیز نمایاں دیکھی وہ یہ تھی کہ اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے چہرے کی کشش اور مسکراہٹ کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مَیں اسے اُس وقت سے جانتی تھی جب اس کی عمر سولہ سال تھی۔ ہماری پہلی ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ اُس وقت ہم فسٹ ایئر میں تھیں۔ میرے اور اس کے گھروں کے معیار میں مالی لحاظ سے کوئی فرق نہیں تھا۔ ہمارے گھرانے درمیانہ درجے کے تھے۔ فرق یہ تھا کہ اس کا خاندان شہر کے پرانے حصے میں رہتا تھا اور ہم بہتر قسم کے علاقے میں رہتے تھے۔ اس کے گھر میں پردہ تھا، میرے گھر میں یہ پابندی نہیں تھی۔ وہ برقعے میں کالج آیا کرتی تھی۔ اس کی جس خوبی نے مجھے اپنی طرف کھینچا تھا وہ اس کا چہرہ اور اس کا جسم تھا۔ اس کا رنگ سفید اور سانولے کے درمیان کا کوئی رنگ تھا جو بڑا ہی بھلا لگتا تھا۔ چہرے کے نقش بہت پیارے اور آنکھیں مستانی سی تھیں۔ جسم کی ساخت اور چال میں عجیب سی کشش تھی۔ اس کے

ہونٹ قدرتی طور پر ایسے تھے جیسے مسکرا رہی ہو حالانکہ وہ مسکرانا جانتی ہی نہیں تھی۔ اُداس رہتی تھی۔

ہم سہیلیاں بن گئیں۔ مَیں اس کے مقابلے میں بدصورت تو نہیں تھی لیکن ہم اکٹھی ہوتیں تو دیکھنے والوں کی نظریں اسی پر اٹھتیں اور اسی پر جمی رہتی تھیں۔ ہماری جب دوستی پکّی ہو گئی تو میں نے محسوس کیا کہ اسے احساس ہی نہیں کہ وہ خوبصورت ہے۔ وہ مایوس اور بے چین رہتی تھی۔ باتیں شکایتوں کے لہجے میں کرتی تھی۔ کبھی کبھی موڈ میں آتی تھی تو بڑی دلچسپ اور پُرلطف باتیں کرتی تھی۔ مَیں اسے سادہ لڑکی سمجھتی تھی۔

تین مہینے کی دوستی کے بعد وہ پہلی دفعہ میرے گھر آئی۔ یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اُس روز کالج سے کیوں بہت جلدی چھٹی مل گئی تھی۔ مَیں نے اسے کہا کہ چلو تمہارے گھر چلتے ہیں لیکن اس نے کہا کہ نہیں، تمہارے گھر چلتے ہیں۔ مَیں اسے اپنے گھر لے گئی۔ میرے ابّا جان کو گُردے کی تکلیف تھی۔ وہ ٹھیک تو ہو گئے تھے لیکن ابھی چھٹی پر تھے۔

ہم گھر میں داخل ہوئیں تو ابّا جان صحن میں کُرسی پر بیٹھے تھے۔ مَیں نے ان سے صحت کے متعلق پوچھا اور پھر اپنی سہیلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میری سہیلی نگہت ہے۔"

ابّا جان اُٹھے اور نگہت کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا — "بہت خوبصورت سہیلی بنائی ہے تم نے؟" — پھر نگہت سے میرے متعلق کہا — "یہ فرزانہ کی بچپن کی عادت ہے۔ مَیں اس کے لیے کبھی کوئی

گڑیا لایا کرتا تھا تو یہ پھینک دیا کرتی تھی۔ کہتی تھی یہ خوبصورت نہیں ہے، میں خود دیکھ کر لاؤں گی۔ میں اسے بازار لے جاتا اور جو گڑیا اسے پسند ہوتی وہ لیتی"۔

ابّا جان نے میرے متعلق بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اللہ انہیں جنّت عطا فرمائے۔ ان کے مزاج میں شگفتگی تھی۔ باتیں ایسے پُر تکلف انداز سے کرتے تھے کہ بے مزہ سی بات کو بھی لطیفہ بنا دیتے تھے۔ امّی مرحومہ کی عادت بھی ان سے ملتی جلتی تھی۔

میں گھر میں سب سے بڑی تھی۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں ہم سب رات کا کھانا اکٹھے بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ میرے گھر کی فضا میں کوئی گھٹن نہیں تھی۔ بچوں کی بلاوجہ کی لڑائی اور دھینگا مشتی نہیں تھی۔ ابّا جان اور امّی کی آپس میں کبھی تُرش کلامی نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو میں نہیں مانتی کہ وہ آپس میں کبھی لڑے ہی نہیں ہوں گے لیکن وہ ہم بچوں کے سامنے کبھی نہیں لڑتے تھے یا ہمیں انہوں نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ گھر میں کوئی بے مزگی پیدا ہوئی ہے۔

نگہت کو دیکھ کر ابّا جان مرحوم نے لطیفوں کے رنگ میں ایک دو باتیں کیں اور میری امّی کو آواز دے کر کہا ــــ "تم نے تو ساری جوانی باورچی خانے میں گزار دی ہے۔ بڑھاپے میں ہی کبھی ہمارے پاس آ جایا کرو۔ دیکھو تمہاری فرزانہ کتنی پیاری سہیلی لائی ہے"۔

امّی دوڑی آئیں اور نگہت کے سر اور مُنہ پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ میں اور نگہت اپنے کمرے میں جا بیٹھیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے بہن بھائی سکول سے آ گئے۔ سب نے میرے کمرے میں آ کر مجھے سلام کیا۔ نگہت کے متعلق پوچھا کہ کون ہے۔ اسے بھی سب نے سلام کیا اور پھر ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ہم ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانے والے لوگ نہیں تھے۔ فرش پر دری بچھا لیا کرتے تھے۔

امّی ہانڈی، روٹیاں اور پانی کی بالٹی پاس رکھ لیا کرتی تھیں۔ کھانے کے دوران گپ شپ چلتی تھی جس میں زیادہ تر بچّے بولا کرتے تھے۔ ابّا جان بچوں کے ساتھ بچّے بن جایا کرتے تھے۔

اُس روز جب کھانے پر نگہت ہمارے ساتھ تھی، ہمارا کنبہ معمول سے زیادہ ہی زندہ دل ہو گیا تھا۔ آج گھر کی ان ہنستی مسکراتی محفلوں کو یاد کرتی ہوں تو آنسو نکل آتے ہیں۔ وہ دن خواب بن گئے ہیں۔ امّی فوت ہو چکی ہیں۔ اب میں امّی ہوں۔ اپنے گھر کا وہی ماحول برقرار رکھتی ہوں جو میرے والدین نے پیدا کر رکھا تھا۔ ایک حادثے نے میرے گھر کو تباہ کر دیا تھا لیکن والدین کی تربیت کی بدولت میں نے سہاگ کے کھنڈروں پر نئی عمارت کھڑی کر لی ہے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ میں نگہت کی بات سُنا رہی تھی۔ اس نے میرے پورے کنبے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ہم سب ہنستے رہے مگر نگہت کو دیکھا کہ وہ اداس تھی۔ اُداس تو وہ اکثر رہتی تھی۔ اس روز میں نے اس کے چہرے پر پریشانی بھی دیکھی۔

کھانے کے بعد ہم دونوں الگ جا بیٹھیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں پریشان لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں پریشان ہو گئی۔ بار بار پوچھنے پر اس نے کہا ــــ "فرزانہ، مجھے معاف کر دینا۔ میں آئندہ یہاں نہیں آیا کروں گی اور تمہارے ساتھ دوستی اتنی گہری نہیں رکھ سکوں گی"۔

میں شرمندہ سی ہو گئی۔ میں سمجھی کہ میرے ابّا جان کے مذاق کا اس نے بُرا منایا ہے۔ وہ پردہ دار لڑکی تھی۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا ــــ "میں نہیں اپنے جیسی غریب گھرانے کی لڑکی سمجھتی تھی لیکن تمہارے گھر آ کر دیکھا ہے کہ تم

امیر لوگ ہو۔ میری تمہاری دوستی نبھ نہیں سکے گی۔"

گزشتہ تین مہینوں میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جس قدر خوبصورت تھی اس میں اتنی ہی زیادہ گھٹن تھی۔ میں کھُل کر بات کرتی تھی اور وہ ادھوری سی بات کہہ کر باقی پی جاتی تھی۔ میں ہنسنے کی عادی تھی اور وہ آہیں بھرنے کی۔ وہ کبھی کبھی مسکرایا کرتی تھی۔ ظاہری طور پر ہم دونوں کے مزاج بہت ہی مختلف تھے پھر بھی وہ مجھے اچھی لگتی۔ میں نے اسے احساسِ کمتری سے نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔

اب اس نے ہمارے گھر میں امیری اور غریبی کی بات چھیڑی تو میں حیران ہوئی کہ اس نے میرے گھر میں کون سی امیری دیکھی ہے۔ میں نے ابھی اس کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے ابّاجان کتنی تنخواہ لیتے ہیں؟"

"تین سو پچیس روپے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور میرے ابّاجان تین سو پچاس روپے لیتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

یاد رکھئے کہ ۱۹۴۹ء میں سوا تین سو اور ساڑھے تین سو کو نہایت اچھی تنخواہ کہا کرتے تھے۔ بازار کے بھاؤ آج کی طرح ہوشربا نہیں تھے۔ تین سو روپے تنخواہ پانے والے کنبے کو فارغ البال سمجھا جاتا تھا۔ اگر مکان اپنا ہو تو کچھ پیسے بچ بھی جایا کرتے تھے۔

میں نے نگہت سے پوچھا — "تم کتنے بہن بھائی ہو؟" — اس نے اتنے ہی بتائے جتنے ہم تھے — میں نے پوچھا — "تم مکان کا کرایہ کتنا دیتے ہو؟" — اس نے بتایا کہ مکان ان کا اپنا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم مشرقی پنجاب کے مہاجر ہیں اور جس مکان میں رہتے ہیں اس کا پینتیس روپے کرایہ گورنمنٹ کو دیتے ہیں کیونکہ یہ متروکہ مکان ہے۔

پھر میں نے اس سے پوچھا — "آج تمہارے گھر میں کیا پکا ہو گا؟" —

اس نے جواب دیا کہ امی کہہ رہی تھیں کہ گوشت اور پالک پکائیں گے۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ ابھی ابھی میرے ساتھ اس نے ماش کی دال کھائی ہے۔ اس کے ساتھ پیاز اور ٹماٹر کٹے ہوئے تھے اور پودینے، ہری مرچوں اور انار دانے کی چٹنی تھی۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ ہم کفایت شعاری کر رہے ہیں کیونکہ اپنا مکان بنوانا ہے۔ میں اس ارادے سے کالج میں داخل ہوئی ہوں کہ بی اے کر کے بی ٹی کروں گی اور ملازمت کر کے ابّاجان کا ہاتھ بٹاؤں گی تاکہ وہ مکان بنا سکیں یا کم از کم میرے جہیز کا ان پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔

میں نے اسے گھر کی حالت پوری طرح بتائی اور جب یہ بتایا کہ میرے گھر میں مکمل ٹی سیٹ بھی نہیں ہے۔ ایک چائے دانی اور طرح طرح کی پیالیاں ہیں تو وہ بہت حیران ہوئی۔ اس کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی جب میں نے اسے یہ بتایا کہ ہمارے گھر اگر ایک مہمان آ جائے تو ہمارے پاس فالتو رضائی اور گدا نہیں ہوتا۔

وہ سُنتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔ آخر اس نے بیتاب سا ہو کے کہا — "پھر میرے گھر میں کیا نہیں ہے جو تمہارے گھر میں ہے؟ میرے گھر میں دو ٹی سیٹ ہیں۔ رضائیاں اور گدّے بھی کم نہیں۔ مکان تمہارے مکان سے بہت بڑا ہے مگر اپنے گھر میں مجھے غریبی دکھائی دیتی ہے اور تمہارے گھر میں امیروں کی شان نظر آتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میرے گھر میں مجھے بہت سی چیزوں کی کمی نظر آتی ہے۔ میں اور میرے بہن بھائی ترسے ترسے رہتے ہیں جیسے ہمیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا اور نہ اپنی پسند کا کپڑا ملتا ہے۔"

اس کے گھر میں دراصل سکون اور پیار کی کمی تھی۔ یہ مجھے بہت دنوں بعد معلوم ہُوا۔ ایک روز میں اُس کے گھر گئی۔ اُس کا مکان گنجان محلّے میں تھا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے گئی تھی۔ نگہت نے جو نشانیاں بتائی تھیں اُن سے مکان آسانی سے مل گیا۔ چار کمروں کا اچھا خاصا مکان تھا۔ پانچواں کمرہ اُوپر تھا۔ باورچی خانہ اور سٹور الگ تھے۔ برآمدہ تھا۔ صحن کشادہ تھا۔ بیٹھک میں چھت کا پنکھا لگا ہُوا تھا مگر اندر جاتے ہی ایسے معلوم ہونے لگا جیسے کسی سرائے میں آگئی ہوں جو مسافروں سے بھری پڑی ہے۔ بچّے باری باری بیٹھک میں آئے۔ کسی نے سلام نہیں کیا۔ ایک آیا اور مجھے دیکھنے لگا۔ نگہت نے اسے ڈانٹ کر کہا — ”جاؤ باہر کھیلو“ — بچّے نے جواب دیا — ”نہیں جاتا۔“

وہ نکلا تو ایک اور آگیا اور فرش پہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا اور بلاوجہ ہنس کر باہر چلا گیا۔ پھر نگہت کی ایک بہن آئی جس کی عمر بارہ یا تیرہ سال ہوگی۔ میں نے اسے پیار سے بلایا تو وہ دروازے میں کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اتنے میں اس سے چھوٹی ایک اور بہن آگئی۔ پہلے تو مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بڑی بہن کی چُٹیا کھینچی اور بھاگ گئی۔ بڑی بہن اُس کے پیچھے بھاگی۔ برآمدے میں مجھے دھپ دھپ اور چیخ و پکار سنائی دی اور فوراً بعد ایک مرد کی زبردست آواز سنائی دی — ”کیا ہوگیا ہے تمہیں حرام زادیو۔“

میں نے نگہت سے پوچھا — ”یہ کون صاحب ہیں؟“

”ابّا جان۔“ نگہت نے جواب دیا اور اس کی آہ نکل گئی۔

کچھ دیر بیٹھ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ اندر سے پہلے تو دھیمی دھیمی باتیں سنائی

دیں جو ذرا بلند ہونے لگیں۔ بچّوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ مجھے نگہت کے ابّا جان کے یہ الفاظ سنائی دیئے۔ ”یہ مہمانداریاں ہم سے تو برداشت نہیں ہوسکتیں۔ ایسے کالج سے ہم باز آئے۔ گھر بیٹھی رہو۔“

میرے جی میں آئی کہ اندر جاکر نگہت کو روک دوں کہ میرے لیے کوئی تکلّف نہ کرے۔ میں ساری بات سمجھ گئی تھی۔ نگہت آگئی۔ اس کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ میں نے کوئی اور بات شروع کردی لیکن نگہت اُکھڑ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی چھوٹی بہن چائے لے کر آگئی۔ ساتھ سموسے اور دو قسم کے بسکٹ تھے۔ ٹی سیٹ اچھا تھا۔ اگر نگہت کو میں اپنے گھر بلا کر چائے پلاتی تو میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتی کہ ایک ہی قسم کے بسکٹ رکھ دیتی اور وہ سستی قسم کے بسکٹ ہوتے۔ ہمارے گھر میں سموسوں اور دو قسم کے بسکٹوں کی عیاشی کے لیے پیسے نہیں تھے اور اتنا اچھا ٹی سیٹ بھی نہیں تھا۔ نگہت کی بیٹھک میں فرنیچر بھی اچھا تھا۔ کمی اس ماحول میں یہ تھی کہ نگہت کی ماں تک نے بھی نہ سوچا کہ جوان بیٹی کی جوان سہیلی آئی ہے، ذرا اسے مِل ہی لوں بلکہ میں نے نگہت سے کہا — ”تمہاری امّی کو سلام کرلوں۔“

نگہت نے مایوسی کے لہجے میں جواب دیا — ”رہنے دو فرزانہ۔ امّی کوئی اپنی سٹوری شروع کردے گی۔“

میرے اور اُس کے گھر میں جو فرق تھا وہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اسے وہ امیری اور غریبی کہہ رہی تھی۔ یہ دراصل اطمینان اور بے اطمینانی کا فرق تھا۔ میں وہاں گھنٹہ بھر بیٹھی اور اچھی طرح سمجھ گئی کہ اس گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ اگر مجھے اس گھر میں دو دن کے لیے رکھا جاتا تو میں پاگل ہوجاتی یا دم گھٹنے سے مرجاتی۔ میں

جب اس کے گھر کا نقشہ دیکھ آئی تو نگہت نے میرے ساتھ اپنے گھر کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ وہ چار دیواری کی قیدی تھی اور کسی ایسے گناہ کی سزا بھگت رہی تھی جو اُس سے ابھی سرزد نہیں ہُوا تھا۔

ہمارے معاشرے میں لڑکیاں ایسی ہی گھٹن کا شکار رہتی ہیں۔ ان کے دل مُردہ ہو جاتے ہیں اور اُن کی گود سے جو بچے پل کر جوان ہوتے ہیں وہ ایک محدود سی ذہنی سطح سے اُوپر اُٹھ ہی نہیں سکتے۔ ان کی سوچیں پست ہوتی ہیں۔ نگہت کا گھر چار دیواری کی دنیا کی نمائندگی کرتا تھا۔ چونکہ مَیں اس کا گھر اور ماحول دیکھ آئی تھی اس لیے اس نے اب میرے ساتھ دل کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ مَیں دلچسپی اور درد سے اس کے دل میں رُکی ہوئی باتیں سُنتی۔

اس کی باتیں ہمارے معاشرے میں اتنی عام ہیں کہ یہ کسی سنسنی خیز کہانی کا موضوع نہیں بن سکتیں۔ حالانکہ ان بظاہر غیر اہم اور چھوٹی چھوٹی باتوں نے بڑی ہی دردناک کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ نگہت نے کالج کے دوران مجھ سے جو باتیں کیں وہ چند ایک فقروں میں سمیٹی جا سکتی ہیں۔ اس نے ہوش سنبھالا تو باپ نے اسے یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ لڑکیاں بِن بلائی مہمان اور والدین کے لیے وبالِ جان ہوتی ہیں۔ اسے اُٹھتے بیٹھتے یہ طعنے دیئے جانے لگے کہ وہ لڑکی ہے اور گھر کے لیے منحوس۔ قدرتی بات ہے کہ لڑکیاں باپ سے زیادہ پیار مانگتی ہیں مگر نگہت کو ایسا کوئی دن یاد نہیں تھا جب باپ نے اسے پیار سے اُٹھایا یا بلایا ہو۔ اسے یہی معلوم تھا کہ جہاں اُس نے کوئی ضد کی یا بچپنے کی شوخی کی باپ نے اُسے نفرت سے

ڈانٹ دیا۔

لڑکپن میں نگہت نے باپ کے قریب ہو کر اس کے دل میں پیار پیدا کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر باپ نے اسے دھتکار دیا۔ نگہت کے بعد گھر میں اور بچے پیدا ہوئے جن میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ ان کی ماں گھر کے کاموں میں اور بچے پالنے میں مصروف رہتی تھی۔ باپ سرکاری ملازم تھا۔ اُس کے چہرے پر کبھی خوشی کا تاثر نہیں دیکھا گیا تھا وہ اُن لوگوں میں سے تھا جنہیں سفیدی میں بھی سیاہی نظر آ جاتی ہے۔ گھر میں آتا تو منہ بسورے ہوئے اور گھر میں کسی سے بات کرتا تو حکم کے لہجے میں۔ نگہت کی ماں گھُٹی گھُٹی سی عورت تھی۔ وہ شاید خاوند سے ڈرتی تھی اس لیے اس کا ہر حکم بجا لاتی تھی۔

باپ گھر ہوتا تو ایسے پتہ چلتا کہ گھر میں نہیں ہے یا کسی نہ کسی بچے کو معمولی سی بات پر ڈانٹ یا پیٹ ڈالتا۔ اس گھر میں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے کا رواج نہیں تھا بلکہ اکٹھے بیٹھنے کا کبھی موقع پیدا کیا ہی نہیں گیا تھا۔ نگہت جُوں جُوں بڑی ہوتی گئی اس کا دل بُجھتا گیا۔ باپ اسے اس لیے نہیں پڑھا رہا تھا کہ تعلیم ضروری ہوتی ہے بلکہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ بی۔ اے کر کے کہیں نوکری کرے اور اپنا جہیز بنائے۔ مَیں خود اسی ارادے سے کالج میں داخل ہوئی تھی لیکن مجھے اپنے ارادے میں فخر محسوس ہوتا تھا۔ میرے اپنے دل نے کہا تھا کہ کم از کم اپنے جہیز کا بوجھ ابّا جان پر نہ ڈالوں لیکن میرے ارادے میں کسی کے حکم کا دخل نہ تھا۔ یہ مَیں نے خود محسوس کیا تھا کہ مَیں اپنے اتنے پیارے کُنبے کی فرد ہوں اور مجھ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی خوشحالی کے لیے کچھ کروں۔ مگر نگہت کو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ "وہ زندہ رہنا چاہتی ہے تو خود کچھ کرے"

ماں باپ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔

وہ جب کالج سے گھر جاتی تھی تو اسے خود ہی کھانا گرم کر کے کھانا پڑتا تھا۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ اس کے لیے رکھے ہوئے سالن سے بچے بوٹیاں کھا جاتے تھے۔ بچوں میں آپس میں پیار کی جگہ دشمنی تھی کیونکہ اس گھر میں پیار کا وجود ہی نہیں تھا۔ ہر بات ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں ہوتی تھی۔ باپ بچوں اور ان کی ماں کو اپنا قیدی سمجھتا تھا۔ اُن کی ہر حرکت اُسے بُری لگتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ان سے منہ نہیں لگانا چاہتا۔

نگہت کو جو بات سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ لڑکی ہے۔ اگر لڑکا ہوتی تو اسے ماں باپ کا پیار مل جاتا۔ یہ وہم اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ وہ بے کار چیز ہے اور اسے کوئی بھی نہیں چاہتا۔ اس وہم نے اسے کمتری کے شدید احساس میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے میرا گھر اچھا لگتا تھا۔ میں اسے ساتویں آٹھویں روز اپنے گھر لے جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات وہ پچھلے پہر بھی آ جایا کرتی تھی۔ اسے کم از کم یہ سہولت حاصل تھی کہ اسے میرے گھر آنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ کئی بار ایسے ہوا کہ وہ تین تین گھنٹے میرے ہاں رہی۔ ہم نے کھانا کھایا یا چائے پی تو پورا کنبہ اکٹھا بیٹھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ میرے ابّا جان محفل کی جان ہوتے تھے۔ نگہت کا دل ہمارے ہاں لگ گیا اور اسے بھی شگفتہ باتیں کرنے کا ڈھنگ آ گیا۔ میرے بعد اسے میرے گھر کا جو فرد بہت اچھا لگتا تھا وہ میرے ابّا جان تھے۔ نگہت اکثر کہا کرتی تھی کہ تمہارے ابّا جان کو میں ایک باپ نہیں بلکہ پیر اور مرشد سمجھتی ہوں۔ بعض اوقات اُس کے آنسو نکل آتے تھے اور وہ کہا کرتی تھی "کاش میرا باپ بھی ایسا ہی ہوتا۔"

وہ ٹھیک کہتی تھی۔ میرے ابّا جان صرف باپ نہیں تھے، وہ ہمارے دوست

اور ہمجولی بھی تھے۔ وہ اگر نگہت کے باپ کی طرح منہ بسورنا اور گھر میں مار کٹائی کرنا چاہتے تو اُن کے پاس بہت سی وجوہات تھیں۔ ہم اپنی اتنی بڑی حویلی اور گھر کا سارا سامان مشرقی پنجاب میں گنوا آئے تھے۔ میرے دادا جان ہجرت کے دوران فوت ہو گئے تھے۔ انہیں راستے میں ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ رفیوجی کیمپ میں کئی طرح کی ذلّت اور تنگی دیکھی۔ بھوک دیکھی۔ پورا ایک سال پُرانے کپڑوں کو مرمت کر کر کے استعمال کیا اور جب ایک مکان الاٹ ہوا تو میرے ایک تایا نے پورے کا پورا دو منزلہ مکان چوری چھپے اپنے نام الاٹ کرا لیا اور اس کے دو بڑے بیٹوں نے میرے ابّا جان کو ایسی بے ہودگی سے پریشان کیا کہ ہم وہاں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے اور ایک بار پھر مہاجر بن گئے۔ پھر یہ مکان سرکاری کرائے پر ملا اور ہم چڑیوں کی طرح نیا گھونسلہ بنانے لگے۔ ان سے زیادہ مصائب اور کیا ہوں گے۔ لیکن ابّا جان نے مسکراہٹوں سے ہر مصیبت کا مقابلہ کیا اور ہمیں محسوس نہ ہونے دیا کہ یہ کوئی مصیبت ہے۔

یہ ذہنی رجحان کا فرق ہوتا ہے۔ نگہت کا کنبہ مقامی تھا۔ اتنا بڑا اُن کا اپنا مکان تھا۔ ہر آسائش میسر تھی۔ کوئی مصیبت نہیں تھی مگر اُس کا باپ اپنی ذمّہ داریوں اور اپنے بچوں کو ہی مصیبت سمجھ بیٹھا تھا۔ اس رجحان کا اثر جو بچوں پر پڑ رہا تھا وہ نگہت کی رگوں میں زہر کی طرح بھر گیا تھا۔ وہ میرے گھر آتی تھی تو اس کا چہرہ کبھی تو چمکنے لگتا تھا اور کبھی بُجھ کے پژمردہ ہو جاتا۔ اس کے اندر پیار کی جو شدّت تھی وہ اس طرح ظاہر ہوتی تھی کہ وہ میرے ابّا جان کے پاس بیٹھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ابّا جان اس کے ساتھ پیاری پیاری باتیں کرتے اور ہنسی مذاق بھی۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا وہ اپنے گھر سے متنفر اور میرے گھر کی شیدائی بنتی

جا رہی تھی۔ ہر روز وہ مجھے گھر کی کوئی نہ کوئی بے مزگی سنایا کرتی۔ میں دلچسپی سے سُنتی اور اُس کے دل کا غبار ہلکا ہو جاتا۔ اس سے پہلے یہ غبار اس کے اندر جمع رہتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ گھر کی رُوح کش فضا کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اندر ہی اندر کُڑھتی رہتی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ دوستی کر لی تو اس سے اُسے یہ فائدہ ہُوا کہ بجائے کُڑھنے کے وہ دل کی بات کہہ دیتی اور پھر اُس کے چہرے سے اُداسی دُھل جاتی۔ اس کا ایک اثر یہ ہُوا کہ اس کے چہرے کا حُسن نکھر آیا اور دوسرا اثر یہ کہ وہ شوخ ہوتی گئی۔

جب ہم تھرڈ ایئر میں گئیں تو نگہت میں بغاوت کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگے۔ مثلاً ایک بار سڑک پر چلتے چلتے وہ رُک گئی۔ اُس نے برقع اتار کر کندھے پر ڈال لیا اور کہنے لگی — "باہر آکر بھی میں باپ کی قیدی بنی رہتی ہوں" — پھر اُس نے اپنی جوانی اور خوبصورتی کی بھی باتیں شروع کر دیں۔ اور اس کی جو حرکت مجھے بہت بُری لگی وہ یہ تھی کہ وہ گندی گندی باتیں بھی کرنے لگی۔ شاید یہ اسی گھٹن کے اظہار کا ذریعہ تھا جس میں وہ گرفتار رہتی تھی۔

اُس زمانے میں میں ابھی طالبہ تھی۔ نفسیات کی کوئی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ بی۔ اے کر چکنے کے بعد جب مطالعہ کا شوق ہُوا تو نفسیات کی بھی دو چار کتابیں پڑھ لیں۔ ان کی روشنی میں میرے لیے آج نگہت کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات چھپاتی نہیں تھی۔ ایک روز اُس نے بتایا کہ وہ چوری چوری فلم بھی دیکھ چکی ہے۔ وہ گھر دیر سے گئی تو وجہ یہ بتائی کہ میرے گھر چلی گئی تھی۔ میں نے اسے جنسی باتوں اور فلموں سے روکا۔ وہ گھر کی جو باتیں سُناتی تھی ان سے پتہ چلتا تھا کہ اس کا باپ پہلے سے زیادہ غصیلا ہو گیا ہے اور گھر میں بچے پہلے سے زیادہ فتنہ فساد بپا کیے رکھتے ہیں۔ باپ ہر روز

ایک دو بچوں کی پٹائی کرتا ہے۔ حد یہ کہ اُس نے نگہت جیسی جوان لڑکی کی بھی بلا وجہ پٹائی کی۔

بی۔ اے کے آخری سال میں نگہت پوری طرح جوان ہو چکی تھی۔ اس کا دماغ جسم سے زیادہ جوان ہو گیا تھا۔ وہ اب پیار کی تشنگی اور سکون کی باتیں کم اور انتقام کی باتیں زیادہ کرتی تھی۔ ایک روز اُس نے کہا — "مجھے اپنا باپ زہر لگتا ہے۔ میں اگر گھر سے بھاگ جاؤں تو شاید اسے خوشی ہو گی"۔ وہ اب اسے ابا جان نہیں صرف باپ کہا کرتی تھی۔ اس کی بجائے وہ میرے ابا جان سے گھُل مل گئی تھی۔ بعض اوقات میرے گھر آتی تو میرے پاس آنے کی بجائے ابا جان کے پاس جا بیٹھتی۔

یہ کوئی بُری بات نہیں تھی۔ نگہت کی عمر بیس سال اور میرے ابا جان کی عمر پچاس ہونے والی تھی۔ لیکن ان کے چہرے پر شگفتگی کا جو تاثر ہر وقت رہتا تھا اس سے وہ اتنی عمر کے نہیں لگتے تھے۔ انسان کا چہرہ کُڑھنے سے مُرجھا جاتا ہے۔ میرے ابا جان کُڑھنا نہیں جانتے تھے۔ زندہ دل تھے اور اُن کا دل جوان تھا۔ تاہم نگہت کا اُن کے ساتھ بے تکلف ہو جانا کوئی شک والا معاملہ نہیں تھا۔

ایک روز امّی نے مجھے مذاق کے رنگ میں کہا — "فرزانہ! تمہاری سہیلی میں کوئی غیر معمولی کشش ہے اور تمہارے ابا جان بڑے زندہ دل ہیں" — میں نے امّی کو آگے بولنے نہ دیا اور ہنسی ہنسی میں بات ٹل گئی۔ یہ مذاق ہی تھا۔ نگہت کے چہرے میں جادو کا ہی اثر کیوں نہ ہوتا، میں اپنے ابا جان کو جانتی تھی۔ وہ تو نگہت کو میری طرح اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔

بی۔ اے کا امتحان دینے تک نگہت ہمارے کُنبے کا فرد بن چکی تھی۔ فرق یہ تھا

کہ وہ رات اپنے گھر سوتی تھی۔ امتحان ختم ہُوا تو وہ تیسرے چوتھے دن آنے لگی۔ میں وہی ایک دفعہ اس کے گھر گئی تھی جو آپ کو سُنا چکی ہوں۔ چار سال ہو گئے تھے۔ اب امتحان دے کر ملاقات کا یہی طریقہ رہ گیا تھا کہ نگہت میرے گھر آ جاتی تھی۔ ایک بار وہ دس دن نہ آئی جو معمول کے خلاف تھا۔ میں اس کے گھر چلی گئی۔ معلوم ہُوا کہ نگہت بخار میں جل رہی ہے۔ گھر میں وہی اودھم مچا ہُوا تھا۔ برآمدے اور کمروں میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

نگہت نے بتایا کہ بخار کے پہلے دو دن تو اسے دوائی ہی نہیں ملی۔ تیسرے دن باپ سرکاری ڈسپنسری سے مُفت دوائی لے آیا۔ اسے کوئی پرہیزی غذا نہیں مل رہی تھی۔ اس کی ماں سے میں نے دوائی اور پرہیز کی بات کی تو وہ رو پڑی۔ کہنے لگی۔ "پیسے اس کا باپ اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ مجھے اجازت نہیں کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں یا اس کے لیے الگ پرہیزی کھانا پکاؤں"۔ معلوم ہُوا کہ باپ نے بیٹی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے۔ نگہت کی ماں کے کہنے پر ایک روز دوائی لے آیا تھا۔ نگہت بہت روئی۔ کوئی ناواقف آدمی تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ یہ گریجوئیٹ لڑکی ہے یا اس سرائے میں کوئی لڑکی گریجوئیٹ ہو سکتی ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے نگہت سے بخار کی کیفیت اور علامات پوچھیں اور گھر جا کر ابّا جان کو بتایا۔ ابّا جان اُسی وقت ڈاکٹر کے پاس گئے۔ تین دن کی دوائی لے آئے۔ میں نے شام کو جا کر دوائی نگہت کو دے دی۔ تیسرے دن گئی تو اس کا بخار اُتر چکا تھا۔ نگہت نے بتایا کہ اس کے باپ کو معلوم ہی نہیں کہ اسے کوئی دوائی دے گیا ہے۔ میں نے ابّا جان کو اس کی حالت بتائی تو وہ تین دن کی اور دوائی لے آئے اور دو دوائیاں پیٹنٹ بازار سے خرید لائے۔

ابّا جان کی عادت سے ہم سب واقف تھے لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ نگہت میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ اس کی صحت کے متعلق مجھ سے پوچھتے تھے اور مجھے اس کے گھر بھیجتے تھے۔ اس سے مجھے خوشی ہوئی کہ ابّا جان میری دوستی پال رہے ہیں۔
نگہت صحت یاب ہو گئی۔ دو ماہ بعد اس کے چہرے پر رونق بھی واپس آ گئی مگر ہمارے گھر کی رونق ختم ہو گئی۔ امّی بیمار پڑ گئیں۔ پیٹ میں کوئی تکلیف تھی جس سے درد ہوتا تھا اور بخار بھی۔ علاج شروع ہُوا۔ افاقہ ہو جاتا اور دو چار روز بعد تکلیف پھر واپس آ جاتی۔ تین مہینوں میں تین ڈاکٹروں کا علاج ہُوا، پھر ہسپتال میں داخل کرایا مگر ڈاکٹر ہار گئے، موت جیت گئی۔ ہم امّی کی میّت اُٹھا لائے۔ یوں قیامت آئی کہ گھر کی خوشیاں تباہ ہو گئیں۔

ابّا جان ثابت قدم رہے۔ انہوں نے ہمارے لیے ماں بننے کی بھی کوشش کی لیکن امّی کی جگہ اب کوئی بھی پُر نہیں کر سکتا تھا۔ ابّا جان کو ترقی مل چکی تھی۔ تنخواہ خاصی ہو گئی تھی۔ انہوں نے نوکرانی رکھنے کو کہا لیکن جس باورچی خانے میں امّی کا راج تھا وہاں میں کسی نوکرانی کا وجود برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے خود امّی کی جگہ سنبھال لی۔ امّی کی بیماری کے دوران مجھے ایک سکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے تیس تیس روپوں کی تین ٹیوشنیں بھی شروع کر دی تھیں۔ میرے لیے گھر سنبھالنا، سکول پڑھانا اور وہاں سے آ کر تین لڑکیوں کو پڑھانا ممکن نہیں تھا۔
نگہت آ جاتی تھی اور گھر کے کام میں بہت مدد دیتی تھی۔ میں اپنی بہنوں پر گھر کا کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ انہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ دونوں بھائی اور دونوں بہنیں سکول میں پڑھتی تھیں۔ اب نگہت اپنے گھر سے اتنی آزاد بلکہ باغی

ہوگئی تھی کہ دو دو اور تین تین دن میرے گھر رہتی۔ کہتی تھی کہ وہ ماں اور باپ کو بتا کر آئی ہے۔ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ اس کا باپ اسے اتنے دن باہر رہنے کی اجازت بھی دیتا ہوگا۔

ایک روز وہ بہت بھڑکی ہوئی آئی۔ غصے میں اس نے سچی بات کہہ دی۔ اس نے بتایا کہ وہ جب بھی یہاں دو تین روز رہ کر گھر جاتی ہے تو باپ کے ساتھ لڑائی ہوتی ہے۔ وہ اب باپ کا ذرہ بھر احترام نہیں کرتی تھی۔ اب باپ نے اسے آنے سے روکا تو وہ لڑ جھگڑ کر آگئی۔ کہنے لگی "اب پورے دس دن یہیں رہوں گی۔"

میں نے اُسے اس بدتمیزی سے روکا لیکن وہ پوری طرح باغی ہو چکی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ایک آدھ دن رہ کر چلی جائے مگر اس نے پورے دس دن رہنے کا اعلان کر دیا۔

یہ کوئی اچھی بات تو نہیں تھی کہ وہ باغی ہوگئی تھی لیکن اس کی بغاوت کی وجوہات ہی کچھ ایسی تھیں۔ ایسی لغزش ہمارے گھرانوں میں عام ہے کہ گھر میں گھٹن اور بے جا پابندیاں ہوتی ہیں اور لڑکیوں کو کالج میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ پرندے کو پنجرے سے نکال کر کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ پھر ایک روز یوں ہوتا ہے کہ پرندہ پنجرے کی قید سے اکتا کر واپس جاتا ہی نہیں۔ گھر میں اولاد کو پیار، سکون اور اہمیت ملتی رہے تو اولاد کالج سے چھٹی ہوتے ہی بھاگم بھاگ گھر پہنچتی ہے۔ نگہت کا معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اس نے آزادی کا مزہ بھی چکھ لیا تھا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ گھروں کی فضا تو کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ لڑ جھگڑ کر گھر سے نکل آتی تھی۔ اس پر ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ اور میری نصیحتیں اب کوئی اثر نہیں کرتی تھیں

یہ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ جب ہمارے گھر رہتی تھی تو میرے ابّا جان کے پاس بیٹھنے کی زیادہ کوشش کرتی تھی۔ اب وہ زیادہ دنوں کے لیے آگئی تو اس نے گھر سنبھال لیا اور میں مطمئن ہوگئی تھی۔ امّی کو فوت ہوئے آٹھ نو مہینے گزر چکے تھے۔ نگہت کی موجودگی میں ابّا جان بیمار ہوگئے۔ نزلہ اور بخار تھا۔ وہ کئی روز دفتر نہ گئے۔ ہم سب بہن بھائی صبح صبح چلے جاتے تھے۔ ابّا جان کی تیمارداری کے لیے نگہت رہ جاتی تھی۔

ابّا جان چوتھے روز تندرست ہوگئے لیکن انہوں نے مزید چھٹی لے لی۔ کہتے تھے کہ آرام کی ضرورت ہے۔ ان چند دنوں میں گھر میں وہ انقلاب آیا جو میرے گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا ــــ ابّا جان نگہت کے طلسماتی حسن اور اس کی دیوانہ وار محبت کا شکار ہو چکے تھے۔

یہ انکشاف نگہت نے مجھے یہ کہہ کر کیا ــــ "فرزانہ میں تمہاری سوتیلی ماں بن جاؤں تو کیسا رہے؟"

ایسے اُلٹے سیدھے مذاق بلکہ بیہودہ بکواس تو وہ کیا ہی کرتی تھی۔ میں اسے بھی مذاق سمجھی مگر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ــ "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ابّا جان نے تمہیں شادی کے لیے کہا ہے؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے کہا ہے اور وہ مان گئے ہیں۔"

"تو کیا لوگ میرے ابّا جان کو بدنام نہیں کریں گے کہ بوڑھے نے جوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے؟" میں نے کہا۔

"لوگ کہتے رہیں۔" اس نے کہا۔ "مجھے پرواہ نہیں۔ یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔ جوان لڑکی خود بوڑھے کے ساتھ شادی کر رہی ہے ـــ تمہارے ابّا جان بوڑھے تو نہیں۔ وہ ہر لحاظ سے جوان ہیں۔ میں انہیں خاوند کی حیثیت سے تو دیکھ ہی نہیں رہی۔ انہیں میں اپنا پیر اور اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں۔ فرزانہ، مجھے اس گھر میں پناہ ملی ہے۔ میں اب یہاں سے جاؤں گی نہیں۔ میں نے تمہارے ابّا جان سے بات کی تو فوراً مان گئے اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ مجھے پہلے سے چاہتے تھے۔"

"تمہارے والدین مان جائیں گے؟"

"وہ خوش ہوں گے کہ جہیز کے بغیر کام ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ نہ مانے تو میں انہیں یہ کہہ کر آجاؤں گی کہ میں شادی کر رہی ہوں۔ میں بالغ ہوں۔"

یہ ایک اَن ہونی بات تھی جو مجھے کسی پہلو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ نگہت جو مجھے اتنی اچھی لگتی تھی، بہت بُری لگنے لگی۔ شام کو ابّا جان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ وہ نگہت سے شادی کر رہے ہیں۔

جانے کیوں میرے دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا کہ میری سہیلی مجھ سے اور میرے بہن بھائیوں سے ہمارے ابّا جان کو دُور لے جا رہی ہے۔ میں نے ابّا جان کو روکا اور کہا کہ لوگ بدنام کریں گے مگر انہوں نے جس انداز سے باتیں کیں، میں سمجھ گئی کہ ابّا جان نگہت کی خوبصورتی اور اس کی تیمارداری کے اسیر ہو گئے ہیں۔ نگہت میں اتنی کشش موجود تھی کہ ابّا جان جیسے پختہ کردار کے مرد کو اپنا غلام بنا لیتی۔ نگہت کی محرومیوں کو میں سمجھتی تھی۔ اس کی نفسیات کو بھی سمجھتی تھی۔ اسے باپ کا جو پیار نہیں ملا تھا وہ اس نے میرے ابّا جان سے حاصل کر لیا تھا اور اب ان کی اندھی مرید ہو گئی تھی۔ اس کے

علاوہ نگہت اور ابّا جان گھر میں اکیلے رہ جاتے تھے۔ یہ اس تنہائی کا کرشمہ تھا۔

یہ شادی چپ چاپ ہو گئی۔ عجیب قصّہ یہ ہُوا کہ نگہت کے والدین کے ساتھ ابّا جان نے بات کی تو انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ نگہت جہیز کے بغیر میری سوتیلی ماں بن کے آگئی۔

اور نگہت وہ نگہت نہ رہی جو میری سہیلی ہُوا کرتی تھی۔

میرے چھوٹے بھائی اور بہنیں میرے منہ کی طرف دیکھتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سوال تھا لیکن میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ ابّا جان نے اچھا کیا ہے۔ میری اپنی حالت یہ تھی کہ میں اکیلے میں اکثر روتی تھی۔ ابّا جان میری امّی کی ملکیت تھے۔ ان پر ایک جوان لڑکی قابض ہو گئی تھی۔ ایسے ہی اُوٹ پٹانگ سے خیال تھے جو مجھے بے چین رکھتے تھے۔ تاہم میں نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ نگہت کے آجانے سے میرے گھر میں وہ رونق آجائے گی جو امّی کے ساتھ چلی گئی تھی مگر یہ سب خوش فہمیاں تھیں۔ نگہت نے بڑے ہی گھٹیا ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس کی شکل و صورت اور میرے ابّا جان کی زندہ دلی نے اسے یکلخت کوڑے کرکٹ سے اُٹھا کر باغیچے میں کھلا چھوڑ دیا تھا۔

اس ناگہانی تبدیلی سے نگہت کا دماغ خراب ہو گیا۔ وہ جس پیار کی ترسی ہوئی تھی وہ اسے ابّا جان سے مل گیا۔ ملا بھی اس انداز سے کہ ابّا جان اس کے غلام ہو گئے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ عورت مرد کی بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ بڑے بڑے جری مرد عورت کے سحر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اسی کمزوری کا شکار میرے ابّا جان ہو گئے۔ نگہت کی نفسیاتی محرومیوں نے یہ گُل کھلایا کہ وہ ابّا جان کی مالک بن گئی۔ وہ یہ

بھی برداشت نہیں کرتی تھی کہ ابّا جان پہلے کی طرح ہمارے ساتھ ہنسیں کھیلیں۔

اُس نے ابّا جان کو ہم سے الگ الگ رکھنا شروع کر دیا۔ مَیں نے ایک روز اُسے کہا ــــ "نگہت، اس گھر کا طور طریقہ کچھ اور تھا۔ یہی طور طریقہ تمہیں اچھا لگا تھا جس سے تم اتنا متاثر ہُوئیں کہ تم نے دُگنی سے زیادہ عمر کے آدمی کے ساتھ شادی کر لی۔ اب تم اس فضا کو تباہ کر رہی ہو۔ مَیں نے تمہیں تمہارے گھر کے جہنّم سے نکالا تھا۔"

"دیکھو فرزانہ!" اس نے حاکموں کی طرح مجھے ٹوک دیا اور کہنے لگی۔ "احسان جتانا اچھی بات نہیں ہوتی۔ یہ شادی تم نے نہیں کرائی، یہ میری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے، تمہارے ابّا جان نے مجھے کہا تھا کہ نگہت تم مجھے اتنی پیاری لگتی ہو کہ تمہیں اپنے گھر میں ہی نہیں اپنے دل میں بساؤں گا۔"

یہ میری شکایت کا جواب نہیں تھا۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ اُس کا لب و لہجہ حاکموں والا ہو گیا تھا۔ مَیں گھر کی فضا خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مَیں نے ابّا جان سے بات کی۔ انہیں یاد دلایا کہ امّی کی زندگی میں وہ کس طرح ہمارے ساتھ بچّے بن جایا کرتے تھے۔ ہم اکٹھے بیٹھتے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے تھے مگر اب وہ بات نہیں رہی۔ مَیں روتی رہی مگر ابّا جان کی آنکھوں میں آنسو نہیں آیا۔ انہوں نے نگہت کی وکالت کی۔ اسے نادان، کم عمر اور بے سمجھ کہہ کر اس کی وکالت کی اور مَیں نے جو شکایت کی تھی اس کا کوئی ازالہ نہ کیا۔

ہوتا یہ تھا کہ ابّا جان دفتر سے آتے تو نگہت انہیں اپنے ساتھ کمرے میں بند کر لیتی۔ رات کا کھانا کھاتے ہی انہیں سونے کے کمرے میں لے جاتی۔ چھٹی کے روز انہیں اپنے

ساتھ کمرے میں بند رکھتی یا سیر سپاٹے کے لیے باہر لے جاتی۔ اسے اچھا گھر، اچھے کپڑے، کھانے کو اچھا اور گھر کی بادشاہی مل گئی تھی۔ اس کے چہرے کی اُداسیاں ڈھل گئی تھیں اس سے وہ اور زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔

مجھ پر یہ ذمہ داری آ پڑی کہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے گھر میں پہلی سی فضا قائم رکھوں۔ وہ اپنے اپنے سکول چلے جاتے تھے اور مَیں اپنے سکول پڑھانے چلی جاتی۔ گھر آ کر میں انہیں ساتھ کھانا کھلاتی۔ زیادہ سے زیادہ دیر انہیں اپنے ساتھ رکھتی۔ مگر ابّا جان کی کمی کو ہم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مَیں کوشش کرتی تھی کہ انہیں کوئی بچّہ یاد نہ کرے۔ ہمارے صبر کا یہ امتحان بڑا ہی سخت تھا۔ اس سے پہلے ان کے سکولوں کے اخراجات اور جیب خرچ ابّا جان دیا کرتے تھے۔ اب ان کے اور ابّا جان کے درمیان نگہت حائل ہو گئی۔ اس نے ایک بار بچّوں کو ابّا جان سے پیسے لینے سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھ سے مانگا کرو۔ جب اس سے بچّوں نے پیسے مانگے تو اس نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کا اپنا باپ اس کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

انہوں نے جب مجھے بتایا تو مَیں نے ان کے اخراجات اپنے ذمّے لے لیے۔ مَیں نے اپنی تنخواہ اور ٹیوشنوں کی آمدنی بچّوں کے لیے وقف کر دی اور اپنا سارا پیار بھی اُن کے لیے وقف کر دیا۔ اس سے گھر دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ مَیں اور میرے بہن بھائی ایک طرف اور ابّا جان اور نگہت دُوسری طرف۔

کرتے کرتے یہ دونوں حصّے ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتے گئے۔ نگہت مجھ سے کھچی کھچی رہنے لگی اور ایک روز ہماری پہلی لڑائی ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے میرے سب سے چھوٹے بھائی کو بیہودہ الفاظ میں ڈانٹ دیا تھا۔ مَیں برداشت نہ

کر سکی اور اُسے بے تُکی سُنا ڈالیں۔ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ بچے تمہارے گھر کی طرح کے جھگڑ خانے کے بچے نہیں۔

میں نے اُس روز ابّا جان کو بھی جلی کٹی سُنا ڈالیں مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ ان کی حالت اب شراب اور چرس کے اُس نشئی جیسی ہو گئی تھی جو ہر وقت بیمار رہتا ہو۔

ایک سال بعد میرے لیے ایک رشتہ آیا۔ عجیب قصہ یہ ہُوا کہ نکہت نے مجھے افسروں کی طرح کہا "فرزانہ! میں نے یہ رشتہ منظور کر لیا ہے۔ تمہارے ابّا جان سے میں نے کہہ دیا ہے کہ شادی جلدی ہو جانی چاہیے"۔

میں نے اسے جواب دیا "اپنی شادی کا فیصلہ میں خود کروں گی۔ کب اور کس کے ساتھ کروں گی؟ یہ فیصلہ میرا ہوگا"۔

"میں اُن لوگوں سے وعدہ کر چکی ہُوں"۔ اس نے رُعب سے کہا۔

"تم جاؤ جہنّم میں"۔ میں نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بہنوں اور بھائیوں کو ٹھکانے لگا کر شادی کروں گی۔ میری زندگی ان کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ ابّا جان اب ہمارے ساتھ رسمی سی باتیں کیا کرتے تھے۔ بچے بھی سمجھ گئے تھے کہ ان کا باپ مر گیا ہے۔ ایک سال گزر چکا تھا۔ میں ابّا جان کے چہرے پر نمایاں تبدیلیاں دیکھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے بوڑھے ہو رہے تھے۔ میں نے کہا ہے ناکہ ان کی حالت اُس شرابی یا چرسی کی سی ہو گئی تھی جو ہر وقت نشے میں رہتا ہو۔ نکہت وہ نشہ تھا جس میں ابّا جان غرق ہو گئے۔ دن کے وقت بھی نکہت انہیں کمرے میں اپنے ساتھ بند رکھتی تھی۔

ابّا جان اپنی عمر کو نظر انداز کرتے رہے۔ شادی کے دوسرے سال کے آخر میں مجھے

پتہ چلا کہ ابّا جان کو کوئی تکلیف ہو گئی ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ جا کے دیکھا اور پوچھا۔ انہیں اختلاجِ قلب کی شکایت ہو گئی تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر سے علاج کرا رہے تھے۔ میں اس ڈاکٹر سے ملی تو اس نے مجھے کہا کہ یہ اس عمر میں اتنی جوان لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اُس نے انہیں بیوی سے الگ رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ اگر انہوں نے پرہیز نہ کیا تو دل کا عارضہ لاحق ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا کہ ابّا جان طاقت کی بے حد تیز اور نقصان دہ دوائیاں کھا رہے ہیں۔

میں ایسی باتیں ابّا جان کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی۔ نکہت سے کیس مگر اُس کا ذہن یہ باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے علاوہ وہ میری بات سمجھنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ میں مجبور تھی۔ اپنے باپ سے میں نگاہیں بھی نہیں پھیر سکتی تھی مگر محترم باپ کا یہ حال تھا کہ وہ نکہت کی چرس میں مدہوش رہتے تھے اور اختلاجِ قلب کا علاج بھی کرا رہے تھے۔

شادی کا دوسرا سال بھی ختم ہو گیا۔ ابّا جان اب چہرے سے ستر سال کے بوڑھے لگتے تھے۔ ہو سکتا ہے ان کا دل ابھی تک جوان ہو مگر جسم کی جوانی بڑھاپے کی نذر ہو چکی تھی۔ ان کی شادی کے تیسرے سال کے دوران میری راہ و رسم ایک بڑے اچھے گھرانے سے ہو گئی۔ ان کا ایک بیٹا بی۔ اے کر کے اچھی پوسٹ پر لگ گیا تھا۔ اس کی ماں بڑی ہی ملنسار اور درد مند خاتون تھی۔ یہ پہلی عورت تھی جس کے ساتھ میں نے دل کی اور گھر کی باتیں کیں۔ میری حالت بالکل وہ ہو گئی تھی جو نکہت کی اُس وقت تھی جب وہ اپنے گھر کے رونے میرے آگے رویا کرتی تھی۔

اس خاتون نے میرا دل رکھ لیا اور میرے درد کو اپنا درد سمجھا۔ اس کے خلوص

کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے مجھے اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا تھا۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے صاف الفاظ میں کر دیا۔ مجھے یہ صاف گوئی بہت پسند آئی اور میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

مجھے اس کا بیٹا اس قابل نظر آیا تھا کہ یہ رشتہ قبول کر لوں۔ میں ان کے گھر جانے لگی اور یہ خاتون میرے گھر آنے لگی۔ پھر اس کا بیٹا بھی میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ مجھے اس کی زندہ دلی بہت پسند آئی۔ اس کا انداز میرے ابا جان سے ملتا جلتا تھا۔ ابا جان کو اب اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ میرے پاس کون آتا ہے اور میں کہاں جاتی ہوں۔ اپنے اور اپنے بہن بھائیوں کے متعلق مجھے خود ہی فیصلے کرتے تھے۔ میں نے رسمی طور پر خود ہی منگنی کر لی اور منگیتر کو بتا دیا کہ میں اپنے بہن بھائیوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اُس وقت تک میرا ایک بھائی اور ایک بہن کالج میں تھے اور چھوٹے نویں اور ساتویں کلاس میں تھے۔ میں نے شادی کی یہ شرط طے کرا لی کہ میں سکول اور ٹیوشن پڑھاتی رہوں گی اور ساری آمدنی بچوں پر خرچ کروں گی۔ وہ لوگ اچھے بھی تھے اور ان کے ہاں روپے پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔

ابا جان اور نگہت کی شادی کے چوتھے سال کے آغاز میں میں نے شادی کر لی۔ سہولت یہ حاصل تھی کہ میرے سسرال بشکل ایک فرلانگ دُور رہتے تھے۔ ایسی کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ سُسرال اور یہ میکہ ہے۔ کبھی میں وہاں چلی جاتی کبھی میرے شوہر میرے ہاں آجاتے۔ اس آزادی سے یہ فائدہ ہُوا کہ میں نے اپنے بہن بھائیوں پہ توجہ مرکوز رکھی۔ مگر اس کا ایک بہت بڑا نقصان ہُوا۔ شادی کا دوسرا سال تھا کہ ابا جان کو نگہت کا نشہ لے ڈوبا۔ انہیں فالج کا حملہ ہو گیا۔ جسم کا بایاں مارا گیا۔ زبان

بھی مفلوج ہو گئی۔

ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے کہا — ”مجھے یہی خطرہ نظر آ رہا تھا کہ حرکتِ قلب بند ہو گی یا فالج ہو گا۔ انہیں شروع سے کہہ رہا تھا کہ جوانی اور بڑھاپے کا میل اچھا نہیں ہوتا۔ اعتدال کی ضرورت تھی مگر یہ صاحب انتہا تک پہنچے اور خون کو جوش دینے والی عارضی اثر والی تیز دوائیاں کھاتے رہے۔“

اس نے علاج شروع کیا جس سے ایک ماہ بعد ہلکا سا افاقہ ہُوا۔

علاج چلتا رہا۔ میرے شوہر نے ان کے علاج اور تیمارداری میں بہت بھاگ دوڑ کی۔ میں سکول اور اس کے بعد ٹیوشنوں میں مصروف ہو جاتی تھی۔ میرے شوہر ابا جان کے ساتھ مصروف رہتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے ایک مہینے کی چھٹی لے لی اور سارا سارا دن میرے گھر میں گزارنے لگے۔ دن کے وقت ابا جان کے پاس نگہت ہوتی تھی۔ ابا جان بڑھاپے میں نگہت کا شکار ہو گئے تھے۔ میرے شوہر تو جوان تھے اور ابا جان کی طرح ہی زندہ دل۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ صاحب بھی نگہت کے چہرے اور اُس کی آنکھوں کا شکار ہو گئے۔ یہ مجھے ان کی چھُٹی ختم ہونے کے بعد معلوم ہُوا۔ ایسی بے ہودگیاں چھُپائے چھُپ نہیں سکتیں۔ شوہر کی آنکھیں سب کچھ بتا رہی تھیں۔ وہ جس طرح نگہت کو دیکھتے اور وہ انہیں دیکھتی اور جس طرح وہ باتیں کرتے، اس سے کوئی شک ہی نہ رہا۔ ابا جان اب نگہت کے قابل نہیں رہے تھے۔ وہ تو بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہل جُل بھی نہیں سکتے تھے۔ نگہت کو اُن کے جسم سے پیار تھا۔ وہ جسم ختم ہو چکا تھا۔ اسے اب میرے شوہر کا جسم مل گیا تھا۔

ایک روز میں نے نگہت کے متعلق اپنے شوہر سے کہا کہ وہ ابّا جان کی تیمارداری سے کتراتی ہے تو شوہر نے اس کی وکالت ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں کی جیسے میں نے نگہت کے خلاف بات کر کے جُرم کیا ہو۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کھچے کھچے رہنے لگے۔ میں اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ ان کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ میری اچھی بھلی زندگی کو گھُن لگ گیا اور وہ وقت بھی آیا کہ میرا شوہر جھوٹ مُوٹ کی شکایتیں سامنے رکھ کر مجھ سے اتنی دُور ہٹ گیا کہ ہم رسمی طور پر ذرا دیر کے لیے اکٹھے ہوتے ورنہ الگ الگ رہتے۔

پھر یوں ہُوا جیسے یہ شخص میرا کچھ نہیں لگتا۔ نگہت شام کے وقت باہر نکل جاتی اور رات دیر سے آتی۔ اس دوران میرا شوہر نہ میرے پاس ہوتا نہ اپنے گھر۔ نگہت بڑا شوخ میک اَپ کرنے لگی تھی۔ وہ میک اَپ شام کے وقت کرتی تھی اور باہر نکل جاتی تھی۔ ابّا جان کی تیمارداری مجھ پر اور میرے بہن بھائیوں پر آپڑی۔ علاج ہو رہا تھا۔ اس سے کچھ عرصے بعد یہ افاقہ ہُوا کہ وہ باتیں کرنے کے قابل ہو گئے لیکن صاف نہیں بول سکتے تھے۔

انہوں نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ نگہت اُن سے لاپرواہ ہو گئی ہے۔ ایک بار انہوں نے مجھے بے ساختہ اپنے اُوپر گرا لیا اور بہت روئے۔ میں ان کے جو الفاظ سمجھ سکی، ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہم سے بے رُخی برت کر پچھتا رہے تھے۔ میں نے ان کے دل سے یہ پچھتاوا نکالنے کی کوشش کی مگر نکال نہ سکی۔ نگہت کو شاید یقین ہو گیا تھا کہ ابّا جان کے جسم میں اب پہلی سی زندگی نہیں آسکے گی، اس لیے وہ اُن سے بھی لاتعلق ہو گئی تھی۔

ایک رات میرے شوہر خاصی دیر سے آئے۔ خاصے بھڑکے ہوئے تھے۔ کچھ اس طرح بڑبڑا رہے تھے جیسے کسی کو گالیاں دے رہے ہُوں۔ میں تو اب ان سے بات کرتے ہُوئے بھی ڈرتی تھی مگر ان کی حالت دیکھ کر پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ پھٹ پڑے۔ بڑے غصّے میں مجھ سے پوچھا۔ "وہ واپس نہیں آئی؟"

وہ نگہت کے متعلق پُوچھ رہے تھے۔ میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ "وہ آپ کے ساتھ ہوتی ہے۔ آپ کو ہی معلوم ہوگا کہ وہ واپس آئی ہے یا نہیں"۔

وہ بیٹھ گئے اور سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں نے اور کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے ہارے ہوئے سے لہجے میں کہا —— "فرزانہ، نگہت بڑی ہی بدکار عورت ہے۔ فریب کار اور مکّار بھی ہے"۔

میں نے پوچھا —— "آج آپ کو دھوکا دے گئی ہے؟ آپ سے وعدہ کر کے کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے؟"

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ مجھے دیکھتے رہے اور اُن کے آنسو نکل آئے۔

اُس رات نگہت واپس نہیں آئی۔

پھر نگہت کبھی واپس نہیں آئی۔

میں نے اُسے ۱۹۷۳ء کے آغاز میں راولپنڈی سے گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا۔ جب وہ میرے پاس آکے بیٹھ گئی۔

اُس رات اور اس کے بعد وہ واپس نہ آئی تو میں نے ٹرنکوں کی تلاشی لی۔ امّی کے تمام زیورات غائب تھے۔ میں نے ابّا جان کو نہیں بتایا۔ میرے شوہر نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ وہ نگہت کے ساتھ گمراہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے سارا

الزام اپنے اُوپر لیا۔ مجھ سے معافی مانگی اور انہوں نے مجھے بتایا کہ اکثر شام کے بعد وہ جب باہر جاتی تھی تو میرے شوہر اسے باہر ملتے تھے اور تین چار گھنٹے کسی ہوٹل کے کمرے میں یا شہر سے دُور کسی ویرانے میں گزارتے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ اس دوران نگہت نے کسی اور کے ساتھ بھی تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ وہ بعد میں تقریباً ہر شام باہر نکل جاتی تھی لیکن ہر شام میرے شوہر کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ ہوٹل میں جانے کی اسے عادت پڑ گئی تھی۔ وہاں اسے کوئی ایسا آدمی (یا آدمیوں کا گروہ) مل گیا جو اسے لے اُڑا۔ یہ شک بھی کیا جا سکتا تھا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہوگا لیکن میرے شوہر نے بتایا کہ انہوں نے دو بار اسے ایک ایسے آدمی کے ساتھ دیکھا تھا جو اُونچی قسم کا جرائم پیشہ اور سمگلر مشہور ہے اور اس کا اُٹھنا بیٹھنا بڑے اچھے اور اُونچے حلقوں میں ہے۔

ابّا جان نگہت کے متعلق پوچھتے تھے کہ کہاں ہے۔ پہلے چند دن تو ہم ٹال مٹول کرتے رہے۔ آخر ایک روز بتا دیا کہ وہ لاپتہ ہے۔ یہ صدمہ ابّا جان کو لے بیٹھا۔ پہلے تو اُن کی زبان بند ہو گئی۔ بعد میں دماغ بھی مفلوج ہو گیا۔ یہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق فالج کا نیا حملہ تھا۔ منہ میں چمچ سے دُودھ ڈالتے تھے جو باہر آجاتا تھا۔

تیسرے دن ابّا جان فوت ہو گئے۔ میرے شوہر مستقل طور پر میرے پاس آگئے۔ اس کے بعد ہماری زندگی ہر لحاظ سے اچھی گزری۔ اپنی بہنوں اور بھائیوں کو میں نے اچھے ٹھکانوں تک پہنچا دیا اور اپنے بچّوں کی پرورش میں مصروف ہو گئی۔ نگہت نے جو زخم لگائے تھے، کچھ عرصہ بعد مل گئے۔

اٹھارہ سال بعد، وہ اچانک میرے سامنے آگئی اور میرے پاس آبیٹھی۔ اس

نے بڑے شوخ کپڑے پہن رکھے تھے۔ عطر بڑا تیز لگا رکھا تھا۔ باتوں میں بہت ہوشیار ہو گئی تھی۔ عمر چالیس سال ہو گئی تھی مگر اس کے چہرے اور جسم کی اُس کشش میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا جس نے میرے ابّا جان جیسے صاحبِ کردار شخص پر بھی سحر طاری کر دیا تھا۔ اگر اس کشش میں کوئی فرق آیا تھا تو وہ اسے باتوں کی چاشنی سے پورا کر رہی تھی۔

میں نے اسے کہا — "اور کتنے گھر اُجاڑے ہیں؟"

وہ ہنس پڑی اور مجھ سے گھر، بچّوں اور میرے بچّوں کے باپ کے متعلق دلچسپی سے پوچھتی رہی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ ابّا جان اس کے جانے کے فوراً بعد فوت ہو گئے تھے تو یکلخت اس کے آنسو نکل آئے اور وہ خاصی دیر سر جھکا کر چُپ بیٹھی رہی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ مجھے بتائے کہ کہاں رہتی ہے۔ مگر اس نے نہیں بتایا۔

میں نے پوچھا — "بچے کتنے ہیں؟"

"بچّے پیدا کرنے ہوتے تو گھر نہ بیٹھی رہتی؟" — اس نے جواب دیا۔

"تو اب تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟"

جواب میں وہ صرف مسکرا دی۔ مختصر یہ کہ وہ میرے ہر ایک سوال کو نہایت پیاری مسکراہٹ سے ٹالتی رہی اور اس نے مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ دو سٹوڈنٹ لڑکیاں دوسری سیٹ پر بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ بڑی شوخ لڑکیاں تھیں۔ گاڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نگہت کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر ماضی میں کھو گئی تھی۔ مجھے تو پھر یہ بھی خیال نہیں رہا کہ وہ مجھ سے کیا پوچھتی رہی اور میں اسے کیا بتاتی رہی۔ پھر مجھے اونگھ آنے لگی۔ وہ مجھ سے الگ جا بیٹھی۔ میں سیٹ پر لیٹ گئی اور میری

آنکھ لگ گئی۔

مجھے دھچکا لگا جس سے میں جاگ اُٹھی۔ میں بہت دیر سوتی رہی تھی۔ اُٹھ کے دیکھا نگہت کھڑی تھی۔ دونوں لڑکیاں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ نگہت مجھ سے بغل گیر ہو کے ملی اور گاڑی سے اُتر گئی۔ لڑکیاں بھی اُتر گئیں۔ باہر دیکھا۔ یہ نوشہرہ تھا۔ میں نگہت کو پلیٹ فارم پر جاتا دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکیاں اس کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھیں کچھ آگے جا کر تینوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ میں جان گئی کہ یہ لڑکیاں اس کے ساتھ تھیں، لیکن گاڑی میں وہ ان سے الگ، بعد میں سوار ہوئی تھیں اور راستے میں انہوں نے مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ نگہت کے ساتھ ہیں۔ میں کچھ کچھ سمجھ گئی کہ نگہت کا کاروبار کیا ہے۔ اس نے کہا تھا — "بچے پیدا کرنے ہوتے تو گھر نہ بیٹھی رہتی"۔

گاڑی چل پڑی۔ گھنٹہ بعد پشاور پہنچی۔ میں نے ٹکٹ نکالنے کے لیے پرس کھولا تو اس میں سونے کا قیمتی ہار پڑا تھا۔ میں دیکھ کر کانپ اُٹھی۔ اس کے ساتھ ایک کاغذ تھا جس پر بال پوائنٹ سے لکھا تھا — "پھر کبھی شاید اسی طرح ملاقات ہو جائے۔ میں تمہارے احسان بھول نہیں سکی اور تمہیں جو تکلیفیں پہنچائیں وہ بھی یاد ہیں۔ میری عزیز سہیلی، مجھے معاف کر دینا۔ ایک تحفہ چھوڑ چلی ہوں۔ قبول کر لینا۔ میں اپنے متعلق صرف یہ بتا دیتی ہوں کہ میں اپنے مکروہ گھر کی چار دیواری سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اب ملک کی چار دیواری بھی میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ نگہت"۔

میں نے پشاور سے آکر یہ ہار اور رقعہ اپنے شوہر کو دکھایا تو انہوں نے کہا۔ "وہ بین الاقوامی سمگلروں کے گروہ کی ممبر معلوم ہوتی ہے جس میں تیز طرار لڑکیاں بھی ہوتی ہیں"۔

برادری کی زنجیروں سے جیل خانے کی سلاخوں تک

انہوں نے مجھے سبز باغ دکھائے۔ آٹھ سال کی بیوگی سے ڈرایا۔ مجھے اُٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں ... ایک روز مجھے اپنے باپ سے کہنا پڑا کہ آپ آئندہ یہاں نہ آیا کریں۔

راوی: ز۔ب

تحریر: شمیم اور فردوس

میرے بچے کی عمر سات سال ہو گئی تھی جب اُس نے پہلی بار اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ جب سے اُس کے شعور میں یہ بات آئی تھی کہ بچوں کے باپ بھی ہوتے ہیں جنہیں بچے ابّا کہا کرتے ہیں اُس وقت سے وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "امی جان! میرے ابّا نہیں ہیں؟ ... امی جان! میرے ابّا کہاں ہیں؟"

اُس نے پہلی بار یہ سوال غالباً تین سال کی عمر میں پوچھا تھا اور چار بڑے ہی لمبے لمبے سالوں سے وہ یہی سوال پوچھ رہا تھا۔ مَیں اُسے اکثر یہی ایک جواب دیا کرتی تھی: "تمہارے ابّا جان تمہارے لیے بڑی اچھی اچھی چیزیں لانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔" مَیں اُسے کیسے بتاتی کہ تیرے ابّا جان تیری پیدائش سے چار مہینے پہلے مجھ سے آٹھ سال کے لیے جُدا ہو گئے تھے اور اُن کے اور ہمارے درمیان پتھروں کی اُونچی اُونچی دیواریں اور لوہے کی مضبوط سلاخیں حائل ہو گئی ہیں۔ اگر مَیں اپنے بچے کو بتا دیتی کہ تیرے ابّا جان آٹھ سال کی سزائے قید با مشقت بھگت رہے ہیں تو میرا بچہ یہ ضرور پوچھتا کہ کیوں؟

اس "کیوں" کا جواب بڑا ہی طویل تھا۔ میرے بچے کا ننھا سا، پاک سا اور معصوم ذہن اس جواب کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مَیں اُس کے باپ کو مہینے میں دو بار جیل میں ملنے جایا کرتی تھی۔ وہ سلاخوں اور جالی سے اُدھر اور مَیں اِدھر کھڑی ہوتی تھی۔ مَیں بچے کو کبھی ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ انہوں نے کئی بار کہا تھا کہ بچے کی صورت تو دکھا دو۔ مَیں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ کے جذبات کو اور آپ کی بے تابی کو اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن بچے کو یہاں نہیں لاؤں گی۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ انہوں نے بچے کو ایک بار دیکھ لیا تو اُن کے لیے قید کاٹنی مشکل ہو جائے گی۔ میرا دل خون کے آنسو روتا تھا لیکن مَیں نے اُن کے سامنے آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آنے دیئے تھے۔ آنسو تو ویسے بھی خشک ہو گئے تھے۔ مَیں نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ میرے سامنے ایسے حقائق آ گئے تھے جن کا علاج آنسوؤں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

آپ سُن کر شاید حیران ہو جائیں گے کہ میری ازدواجی زندگی کا وہ آٹھواں مہینہ تھا جب میرا سہاگ آٹھ سال کے لیے جیل میں قید ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کی ابھی مہندی بھی نہیں اُتری تھی کہ مَیں آٹھ سال کے لیے بیوہ ہو گئی۔

وہ طویل آپ بیتی جو مَیں نے اپنے بچے کو نہیں سنائی تھی وہ آپ کو سُنا دیتی ہوں۔ مَیں امیر ماں باپ کی غریب بیٹی ہوں۔ مَیں چونکہ سولہ سترہ سال پہلے کی بات کر رہی ہوں اس لیے "تھا" اور "تھی" کی زبان استعمال کروں گی جیسے میرے ماں باپ مر گئے ہیں وہ زندہ ہیں لیکن میرے لیے مر گئے ہیں۔ ان کی زرعی زمین شہر سے چھ میل دُور تھی اور معلوم نہیں کتنی دُور تک چلی گئی تھی لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ وہ اتنے زیادہ بادشاہ بن جاتے جتنے وہ بن گئے تھے۔ گاؤں میں انہوں نے شہری طرز کی کوٹھی تعمیر کی تھی۔

رہن سہن شہری طرز کا تھا۔ ایک کار بھی تھی۔

ہم اصلاً دیہاتی تھے لیکن میرے والدین اور میرے بھائی اپنے آپ کو شہری کہلاتے تھے۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور ایک مجھ سے چھوٹا تھا۔ ایک بہن تھی جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ بڑے بھائی نے بی اے کیا۔ چھوٹا کالج میں تھا اور بہن سکول میں۔ مگر ہم سب کو تعلیم دلانے کا مقصد تعلیم دلانا نہیں بلکہ لوگوں پر یہ رُعب جمانا تھا کہ ہم بہت اُونچے لوگ ہیں اور ہم ماڈرن ہیں۔

ہمیں شہریوں جیسے کپڑے پہنائے جاتے تھے اور پھر ہماری، ہمارے کپڑوں کی اور ہماری تعلیم کی نمائش کی جاتی تھی۔ ماحول دیہاتی، سادہ اور قدرتی تھا جہاں ہم میں سادگی اور قدرتی پن ہونا چاہیے تھا مگر والدین اور بڑے بھائی کا حکم تھا کہ ہم شہریوں کی طرح رہیں۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ مجھے اس غیر قدرتی سٹائل سے نفرت تھی۔ میرے سارے بہن بھائی شہری بن گئے تھے۔ ان کا بولنے کا انداز بھی مصنوعی ہو گیا تھا لیکن مجھے اپنے گاؤں کی وہ لڑکیاں اچھی لگتی تھیں جو گندے مندے کپڑے پہن کر کھیتوں میں گھاس کاٹنے اور ساگ چُننے جایا کرتی تھیں۔ کبھی اُن کے سروں پر گوبر کے ٹوکرے اور کبھی سروں پر گھڑے ہوتے تھے جو وہ کنوئیں سے بھرنے جایا کرتی تھیں۔ میں بچپن سے ہی ان لڑکیوں میں گھُل مِل گئی تھی۔ اُن کے ساتھ درختوں پر چڑھا کرتی تھی اور گھر آ کر کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے مار اور گالیاں کھاتی تھی۔

میں اپنے مزارعوں کے بچوں کے ساتھ بھی کھیلا کرتی تھی اور یہ ایسا جرم تھا جو میرے والدین نے کبھی نہیں بخشا تھا۔ یہ شاید والدین کی سختی اور بے جا پابندیوں کا نتیجہ تھا کہ وہ مجھے جتنا روکتے تھے میں اتنا ہی ان کی حکم عدولی کرتی تھی۔ بچے کی

نفسیات شاید یہی ہوتی ہے۔ مجھے گاؤں کی اور اپنے مزارعوں کی بچیاں اتنی اچھی لگتی تھیں کہ میں کبھی کبھی اُن میں سے کسی کے گھر کھانا کھا لیتی تھی۔ مجھے شہر سے آئے ہوئے گوشت اور شہری کھانوں سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ دو تین بار اس پر بھی میری پٹائی ہو گئی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ مجھے گھر کے کھانے سے نفرت ہو گئی۔ مجھے اَن پڑھ اور "جاہل" بچیاں شاید اس لیے اچھی لگتی تھیں کہ وہ آزاد تھیں۔ اُن پر شہری سوسائٹی کی کوئی پابندی نہیں تھی اور جب میں اُن کے ساتھ کھیلا کرتی تو میں بھی تمام مصنوعی پابندیوں سے آزاد ہو جایا کرتی تھی۔

میرا اسکول شہر میں تھا۔ کار پر سکول آنا جانا ہوتا تھا۔ اس شاہانہ ٹھاٹھ کے باوجود میں سکول کے بعد گاؤں کی بچیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ انہی کے ساتھ کھیلتے اور چوری چوری اُن کے گھروں میں دال، اچار اور پیاز سے روٹی کھاتے اور ماں باپ کی جھڑکیاں اور مار کھاتے میں نے دس جماعتیں پاس کر لیں۔ مجھے کالج میں داخل کرنے کی باتیں ہوئیں لیکن داخل نہ کرایا گیا۔ میں گاؤں میں رہی۔ والدین اور بھائیوں نے مجھے جدید فیشن میں ڈبو دینے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے اپنی عادتیں اور روش نہ بدلی۔

وقت گزرتا گیا اور میری عمر اکیس سال ہو گئی۔ میرے دونوں بھائی شہر کی خرافات میں پڑ کر آوارہ ہو گئے تھے لیکن وہ اسے آوارگی نہیں کہتے تھے۔ میری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اس موقع پر آ کر میرے والدین دیہاتی بن گئے۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے میرا رشتہ ذات اور برادری سے باہر دینے سے انکار کر دیا۔ ایک طرف تو وہ کسی چھوٹے گھرانے کو پتے نہیں باندھتے تھے کہتے تھے کہ یہ لوگ ہماری ذات

کی توہین ہیں۔ رشتے کی بات چلی تو انہیں اپنی حیثیت اور سطح کا کوئی گھرانہ نظر نہ آیا۔ مگر دقیانوسی پابندیوں کو توڑنے کی بھی وہ جرأت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے برادری میں ایسے لڑکے کی تلاش شروع کر دی جو اگر امیر نہ ہو تو اسے گھر جوائی بنا لیا جائے۔ مجھے وہ ماڈرن لڑکی بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے مگر ماڈرن لڑکیوں کی طرح مجھے اتنی آزادی حاصل نہیں تھی کہ میں اپنی شادی کے متعلق کوئی رائے دے سکتی۔

آخر شہر سے ایک پیغام آ گیا۔ یہ خاندان شروع سے ہی شہر میں آباد تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہاں ان کا اپنا ایک مکان ہے۔ لڑکے کا باپ فوت ہو چکا ہے اور اس نے وہاں ایک کوٹھی بھی بنائی ہے۔ اس لڑکے کی ماں تھی اور دو بہنیں، یہی سارا کنبہ تھا۔ ماں فالج زدہ تھی۔ رشتے کی بات کرنے کے لیے اس کی بہنیں آئی تھیں۔ دونوں کنواری تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی خالہ تھی۔ اس خاندان کے بزرگوں کی ہمارے بزرگوں کے ساتھ رشتہ داری رہ چکی تھی۔ لڑکے کی ماں ہمارے خاندان کو انہی رشتہ داریوں سے پہچانتی تھی۔ میرے باپ نے لڑکے کی بہنوں اور خالہ سے کہا کہ چونکہ لڑکے کا باپ نہیں ہے اور ماں آنے سے معذور ہے اس لیے لڑکا خود ہی آ جائے۔

یہ برادری کے دستور کے خلاف تھا لیکن میرا باپ لڑکے کا انٹرویو لینا چاہتا تھا۔ تین چار دنوں بعد لڑکا آ گیا۔ میں نے اسے چھپ کر دیکھا۔ عمر پچیس سال سے خاصی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال ہے۔ میرے باپ نے اسے دن بھر مہمان رکھا۔ وہ شام کو چلا گیا۔

مجھے اپنی ماں نے بتایا کہ میرے باپ نے میرے امیدوار سے اس کے متعلق جو معلومات حاصل کی ہیں وہ یہ ہیں کہ ماہوار تنخواہ نو سو روپے ہے۔ (آج سے

سولہ سترہ سال پہلے کے نو سو روپے آج کے دو ہزار روپوں کے برابر تھے) - یہ بھی پتہ چلا کہ اس کا ایک آبائی مکان ہے اور ابھی ابھی اس نے ایک کوٹھی بنوائی ہے۔ آئندہ ترقی کا امکان ہے۔ غرض وہ میرے باپ کو پسند آ گیا۔ میری اپنی کوئی پسند نہیں تھی۔ میرے ذہن میں اچھے خاوند کا کوئی تصور نہیں تھا۔ رشتہ طے ہو گیا۔

پھر شادی ہو گئی۔ میرے جہیز کو لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے۔ میرے والدین نے دولت مندی کی خوب نمائش کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے والدین امیر تو ضرور تھے لیکن اتنے نہیں جتنی نمائش کرتے تھے۔ انہوں نے میرے دولہا سے کہا تھا کہ کار پہ آنا اور بارات چار بسوں سے کم نہ ہو۔ لوگ کم بارات پسند کرتے ہیں لیکن میرے والدین نے زیادہ بارات کی شرط عائد کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ذات برادری کے وہ لوگ جو شہر میں رہتے ہیں اور جو کبھی ہمارے گاؤں میں نہیں آئے تھے، گاؤں میں آئیں اور ہماری کوٹھی اور شان و شوکت دیکھیں۔

میں کار پہ دولہا کے ساتھ گئی۔ دولہا مجھے کوٹھی میں لے گئے۔ ہماری کوٹھی کے مقابلے میں یہ صرف نام کی کوٹھی تھی۔ چار کمروں، ایک باورچی خانے، سٹور اور غسل خانے کا اچھی قسم کا مکان تھا جو کوٹھی کی طرز پر کوٹھیوں کے علاقے میں بنوایا گیا تھا۔ اس میں فرنیچر اور دیگر سامان معمولی قسم کا تھا۔ صرف ایک کمرے میں پردے تھے جسے وہ لوگ بیٹھک کہتے تھے۔ میرے جہیز کے فرنیچر سے کوٹھی میں رونق پیدا ہو گئی۔ رات کے وقت جب دولہا کی بہنیں مجھے سونے کے کمرے میں اکیلا چھوڑ گئیں اور دولہا کمرے میں داخل ہوئے تو میں نے ایسے محسوس کیا جیسے میں نے اسی آدمی کو پسند کیا تھا! یہ میرا اپنا انتخاب ہے۔

کچھ دیر بعد جب ہمارے درمیان سے شرم و حجاب کے پردے اُٹھ گئے تو انہوں نے کوئی رومانی الفاظ نہ کہے۔ انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا ——— "ہمارا ساری عمر کا ساتھ ہے۔ اچھا نہیں لگتا کہ تمہیں دھوکے میں رکھوں۔ میں تمہارے ماں باپ سے جو جھوٹ بول چکا ہوں اس کی اصل حقیقت بتا دینا چاہتا ہوں کیونکہ اس گھر کی مالک تم ہو۔ تمہیں میری باتوں سے افسوس تو ضرور ہوگا لیکن میری مجبوریوں کو نہ بھولنا۔"

میں تھوڑا سا گھبرائی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی پہلی بیوی موجود ہے اور انہوں نے جھوٹ بول کر میرا رشتہ لے لیا ہے؟ میں نے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا ——— "تم امیر ماں باپ کی بیٹی ہو۔ میں اتنا امیر نہیں۔ میں نے اپنی تنخواہ نو سو روپے بتائی تھی، جو در اصل پانچ سو روپے ہے۔ یہ کوٹھی بنک سے قرض لے کے بنوائی ہے۔ دو سو روپے ماہوار قسط ادا کر رہا ہوں۔ شہر کی پرانی آبادی میں اپنا مکان ہے جو بہت بڑا ہے۔ اس کوٹھی کا ساڑھے تین سو روپیہ کرایہ مل سکتا تھا مگر میں نے اس خیال سے کرائے پر نہیں دی کہ اتنے امیر ماں باپ کی بیٹی کو میں پرانی حویلی میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ تم جانتی ہو کہ برادری میں عزت اُسی کی ہے جس کی جائیداد ہے۔ اندر سے خواہ وہ کھوکھلا ہی ہو لیکن رہن سہن امیروں جیسا ہو۔ میں نے صرف رشتہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔ اپنی بیمار ماں کو ناراض کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ پرانے مکان میں رہو اور کوٹھی کرائے پر دے دو۔ میں نے تمہارے خاندان میں اپنی عزت اور رُعب قائم رکھنے کے لیے جھوٹ بولا اور نقصان برداشت کیا ہے۔ میں نے کھانا پکانے کے لیے ایک نوکرانی اور دوسرے کاموں کے لیے ایک نوکر رکھ لیا ہے۔"

میں نے انہیں کہا کہ مجھے جہاں رکھیں گے میں رہوں گی، کوئی شکایت نہیں کروں

گی اور یہ بھی کہا کہ وہ کوٹھی کرائے پر دے دیں۔

انہوں نے کہا ——— "حقیقت یہ ہے کہ میں یہ اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ یہ میری ایمانداری کا نتیجہ ہے ورنہ میرا محکمہ ایسا ہے کہ میں پانچ سو کی بجائے پانچ ہزار روپیہ ماہوار کما سکتا ہوں لیکن قسم کھا رکھی ہے کہ حرام کا ایک پیسہ بھی جیب میں نہیں ڈالوں گا۔" انہوں نے ایک بار پھر کہا ——— "یہ بھی میری ایمانداری ہے کہ میں نے تمہیں اپنا غمخوار سمجھ کر صحیح حقیقت بتا دی ہے۔ تم چاہو تو اپنی قسمت پہ رو دو، چاہو تو اپنے ماں باپ کو بتا دو کہ تمہارے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے۔ تمہیں جو باتیں کل معلوم ہوں گی وہ میں نے آج بتا دی ہیں۔ مجھے دل سے قبول کرو نہ کرو، تم پر میرا کوئی زور نہیں۔ تم امیری میں جنی پلی ہو، میں غریب ہوں۔"

اور ایسی ہی باتیں وہ کچھ دیر کرتے رہے۔ جب وہ کئی بار کہہ چکے کہ تم امیر ہو اور میں غریب ہوں تو میں نے اکتا کر کہا۔ "اگر آپ غریب ہیں تو میں بھی غریب ہوں اور میں قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں اسی غریبی میں خوش رہوں گی اور آپ کو خوش رکھوں گی۔ آپ کوٹھی کرائے پر دے دیں۔ کرائے میں سے بنک کے لیے قسطیں نکل آئیں گی اور ایک سو روپیہ بچ بھی جایا کرے گا۔ ہانڈی روٹی اور دوسرے کام میں خود کیا کروں گی۔ نوکرانی اور نوکر کو نکال دیں۔"

وہ نہیں مانتے۔ کہنے لگے۔ "میں برادری کو جانتا ہوں۔" انہوں نے "برادری" پر الزام عاید کیا تھا لیکن وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ میں تمہارے والدین اور بھائیوں کو جانتا ہوں۔

میں نے یہ پیش کش کر کے اُن پہ احسان یا اپنے اُوپر جبر نہیں کیا تھا۔ میں نے

جو کچھ کہا وہ دل کی گہرائیوں سے کہا تھا۔ انہیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے اپنے والدین کی امارت ذرہ بھر پسند نہیں اور خدا نے مجھے سادگی عطا کی ہے۔ میں اپنے گھر کو یعنی اپنے خاوند کے گھر کو قدرتی رنگ میں آباد کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اچھی آمدنی اور پیسے سے تو نفرت نہیں تھی لیکن نمود و نمائش سے مجھے چڑ تھی اور یہ تو مجھے بالکل ہی پسند نہیں تھا کہ اپنے آپ کو سُولی پر کھڑا کر کے لوگوں پر دھونس جمائی جائے کہ ہم امیر ہیں۔

میرے دُولہا کو ڈر تھا کہ میں ان سے بگڑ جاؤں گی اور اپنے والدین سے شکایت کروں گی لیکن مجھ پر اُلٹا اثر ہُوا جو میری فطرت کے عین مطابق تھا۔ مجھے یہ آدمی صاف گوئی اور ایمانداری کی وجہ سے بہت ہی اچھا لگا۔ اس آدمی نے کہا تھا کہ تمہیں اپنا غمخوار سمجھ کر حقیقت بتا رہا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے اپنے اُوپر کوئی جبر نہیں کرنا پڑا۔ مجھے اس قدر خوشی محسوس ہُوئی جیسے میری شادی اُس آدمی کے ساتھ ہو گئی ہے جسے میں بڑی مُدت سے چاہتی تھی۔ میں نے اُن کے دل سے یہ سارا بوجھ جو انہوں نے مجھے دکھا دیا تھا اُتارنے کی پوری کوشش کی لیکن میں محسوس کر رہی تھی کہ سارا بوجھ نہیں اُترا۔ اُن کے دل پر برادری کے رسم و رواج اور پابندیوں اور تنگ نظری کا جو ڈر تھا وہ غلط نہیں تھا۔ برادریوں نے عورت کو کھلونا بنا رکھا ہے جسے برادری بچوّں کی طرح توڑتی اور اس کا انجر پنجر بکھیر دیتی ہے۔

ازدواجی زندگی کی پہلی رات گزر گئی۔ اگلے روز ولیمہ تھا۔ مہمانوں کا لشکر دیکھ کر میں کانپ اُٹھی۔ میرے سُسرال میں اتنی بڑی دعوتِ ولیمہ کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے دُولہا نے بتا دیا تھا کہ وہ آٹھ ہزار کے مقروض ہو گئے ہیں۔

پھر میں میکے گئی اور پھر میں سسرال آئی۔ اُن کی بہنیں تو مجھے مل چکی تھیں ولیمے کے روز بھی ساتھ تھیں۔ اڑھائی سو عورتیں تین سو بچوّں کے ساتھ مدعو تھیں۔ میں ابھی ساس سے نہیں ملی تھی۔ وہ فالج سے پُرانے مکان میں پڑی تھی۔ اپنے بیٹے کی خوشی بھی نہیں دیکھ سکی۔ میں دل میں جذبات کا طوفان لیے اسے ملنے گئی مگر اس نے یہ کہہ کر اس طوفان کو روک دیا ——— "اگر تم شریفوں کی بیٹی ہو تو خاوند کو اس مکان میں لے آؤ۔ ہم کوٹھیوں میں رہنے والے لوگ نہیں۔ ابھی تو کوٹھی کا سارا قرضہ ادا کرنا ہے"۔ اس کے بعد ساس نے جو باتیں کیں اُن سے یہ ظاہر ہُوا کہ وہ میرے ساتھ ناراض تھی کیونکہ میں نے اس کے بیٹے کو اُس سے الگ کر دیا تھا اور میں کوٹھی میں رہنا چاہتی تھی۔

میں نے انہیں پہلی رات کی وہ ساری باتیں سُنائیں جو اس کے بیٹے اور میرے درمیان ہُوئی تھیں مگر بُڑھیا نے مجھ پر اعتبار نہ کیا۔ البتہ یہ دیکھ کر خوشی ہُوئی کہ میرے خاوند کی دونوں بہنیں میرے حق میں تھیں۔ میں نے انہیں بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کو مجبور کریں کہ کوٹھی کرائے پر دے دیں اور ہم اس مکان میں آ کر رہتے ہیں۔

مجھے یہ مکان زیادہ پسند تھا۔ خاصی فراخ حویلی تھی جو اُن کے باپ دادا نے بنائی تھی۔ نیچے بھی کمرے تھے اور ایک منزل اُوپر تھی جس کے تین کمرے پُرانے زمانے کے پلنگوں، ٹرنکوں اور کوڑا کباڑ سے بھرے ہُوئے تھے۔ میں نے ساس سے کہا کہ آپ لوگ اُوپر چلے جائیں اور نیچے کا حصّہ کرائے پر دے دیں۔ ڈیڑھ سو روپیہ تو مل ہی جائے گا۔

ساس نے ناک سکیڑ کر کہا ——— "تم کوٹھی میں رہو اور ہم بزرگوں کی جائیداد کرائے

"پر دے دیں" اور جب میں نے انہیں کہا کہ میں بھی یہیں آ جاؤں گی اور کوٹھی بھی کرائے پر دے دیں گے تو ساس نے کہا ——— "کوٹھی کرائے پر دی جا سکتی ہے کیونکہ یہ اسی خاندان کے لیے بنائی تھی۔ بزرگوں کے مکان کرائے پر نہیں دیئے جاتے۔ لوگ کہتے ہیں یہ کمین ذات کا خاندان ہے۔ بڑوں کی قبروں سے کرایہ کھا رہا ہے۔"

میں بڑھیا کو منا نہ سکی۔ اس کی عقل پر بہت افسوس کیا اور چپ ہو رہی۔

شادی کیے بیس پچیس روز گزر گئے۔ میں دلہن سے بیوی بن گئی۔ میرا باپ ایک دفعہ میرے ہاں آیا۔ بھائی آتے ہی رہتے تھے۔ ایک روز میرے ایک بھائی نے میرے خاوند سے کہا "بھائی جان آپ گاڑی کیوں نہیں لے لیتے؟ ہم تو کار کے بغیر جینا حرام سمجھتے ہیں۔" وہ دونوں کار پر آیا کرتے تھے اور بعض اوقات دو تین دوستوں کو بھی ساتھ لاتے تھے۔ چائے ہو یا کھانا، بہت خرچ کراتے تھے۔ میرے پاس سلامیوں کے اور والدین کے دیئے ہوئے خاصے پیسے تھے۔ میں وہ خرچ کرتی رہی تاکہ خاوند کی تنخواہ پر بوجھ نہ پڑے مگر مہمانداری کا یہ سلسلہ کہیں رکنے والا نہیں تھا۔ خاوند کوٹھی چھوڑنے اور نوکروں کو جواب دینے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک روز دونوں نوکروں کو نکال دیا اور باورچی خانہ سنبھال لیا۔ وہ دفتر سے آئے تو روزمرہ کی طرح شاہانہ ٹھاٹھ سے نوکر کو بلایا۔ میں نے بتایا کہ اب مجھے ہی نوکر سمجھیں۔ وہ پہلے تو حیران ہوئے پھر بگڑنے لگے۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا "یہ گھر میرا ہے۔ جس طرح آپ اپنے کام کاج میں آزاد ہیں اسی طرح مجھے میرے کام میں آزاد کر دیں۔ گھر چلانا میرا کام ہے۔ میں اسے آمدنی کے مطابق چلاؤں گی۔ آپ پر کوٹھی کا قرضہ الگ اور شادی کا الگ ہے۔"

وہ خاموش ہو گئے مگر میری دو تجویزیں انہوں نے سختی سے رد کر دیں۔ ایک یہ کہ کوٹھی کرائے پر دے دیں اور دوسری یہ کہ پرانے مکان کا نیچے والا حصہ بھی کرائے پر دے دیں۔ انہوں نے ابھی ایک خوفناک بوجھ کے متعلق تو بات ہی نہیں کی تھی۔ یہ بوجھ اُن کی دو کنواری بہنوں کا تھا۔ ایک میری ہم عمر تھی اور دوسری کی عمر سولہ سال ہو گئی تھی۔ ان کی ماں کے علاج کے اخراجات الگ تھے۔

لیکن میرے خاوند کے خدشے غلط نہیں تھے۔ انہی کے پیشِ نظر وہ کوٹھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ خدشے ایک ایک کر کے بڑی جلدی سامنے آ گئے....

ایک روز میرا باپ آیا۔ میں باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ میں تو باپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی لیکن مجھے باورچی خانے میں ہانڈی پکاتے دیکھ کر باپ کو بہت افسوس ہوا۔ نوکرانی کے متعلق پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ دونوں نوکر نکال دیئے ہیں۔ میں نے انہیں دانستہ وجہ نہ بتائی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں نے انہیں بتا دیا کہ میرا خاوند مقروض ہے اور میں اُن کے لیے بچت کر رہی ہوں تو میرے باپ کے دل میں میرے خاوند کی عزت ختم ہو جائے گی جب کہ ضرورت یہ تھی کہ ان کے دل میں ہمدردی اور حوصلہ افزائی کا جذبہ پیدا ہوتا۔

میرے باپ کو میرا کام کرنا اچھا نہیں لگا۔ شام کو میرے خاوند آئے تو میرے باپ نے بات تو اطمینان سے کی لیکن اس میں زہریلا تیر تھا۔ اس نے میرے خاوند سے کہا۔ "میری اس بچی نے آنکھیں کھولی تھیں تو اس نے گھر میں چار نوکر دیکھے تھے اور یہاں آ کر یہ ہانڈی روٹی خود کر رہی ہے۔ یہ ہمارا رواج نہیں۔ میری اولاد نوکروں میں پلی ہے۔ یہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی عادی نہیں۔"

خاوند نے اپنی صفائی پیش کی اور میں نے نوکروں کو نکالنے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لی مگر باپ نے میری ایک نہ سُنی اور اُن سے کہا کہ تمہارے گھر میں برادری کے اچھے بُرے لوگ آتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے جب میری بیٹی باورچی خانے میں سارا کام خود کرے گی تو نہ تمہاری عزّت رہے گی نہ میری۔ تم اتنی زیادہ تنخواہ لیتے ہو۔ دو نوکر آسانی سے رکھ سکتے ہو۔

اس کے بعد میرے باپ نے ایک اور تیر چلایا۔ اس نے کہا۔ "اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو تو منگوا لیا کرو۔ ہو سکتا ہے تمہیں اپنی عزّت کا خیال نہ ہو۔ خدا کے لیے میری عزّت کا خیال رکھو۔ میں نے ساری ذات برادری کو اپنے پاؤں میں بٹھایا ہُوا ہے۔"

باپ تو چلا گیا مگر میرے خاوند پر ایسی خاموشی طاری کر گیا جسے میں نے بڑی ہی مشکل سے توڑا۔ وہ مجھ سے ناراض ہونے لگے کہ میں نے نوکرانی اور نوکر کو نکال کر ان کی بے عزتی کرا دی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ قرض تلے دبے رہنا کوئی عزّت والی بات نہیں۔ مجھے اپنے باپ کی جھوٹی عزّت کا ذرّہ بھر خیال نہیں، مجھے آپ کی اور اپنے گھر کی عزّت کا خیال ہے۔ میں انہیں اس پر بھی راضی کرنا چاہتی تھی کہ کوٹھی کرائے پر دے دیں لیکن وہ نہ مانے۔ اس کے جواب میں میں نے اُن کی یہ بات نہ مانی کہ نوکرانی اور نوکر کو واپس بُلا لیا جائے۔

اُدھر میری ساس دن بدن میرے خلاف ہوتی گئی۔ میں وہاں جاتی تھی تو وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔ میں اور اس کی دونوں بیٹیاں مِل کر بھی اُس کا یہ وہم دُور نہ کر سکیں کہ میں کوٹھی سے نہیں نکلنا چاہتی۔

میرے بھائی میرے پاس آتے رہتے تھے۔ بڑا بھائی تو اوباش شہزادہ بنتا جا رہا تھا۔ دُوسرا بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ کار پر آیا کرتے تھے۔ تیسرے چوتھے روز پکڑ دیکھے آجاتے۔ ایک رات تو ضرور ہی رہتے۔ کبھی دو راتیں بھی رہتے۔ وہ اوچھی حرکتیں زیادہ کرتے تھے۔ میرے خاوند پر اپنی امیری کا رُعب جمانے کے لیے کبھی کہتے کہ آپ کے پردے معمولی ہیں۔ کبھی کہتے کہ کوٹھی بہت چھوٹی ہے۔ میرے جہیز کے علاوہ پہلے کا جو فرنیچر پڑا تھا وہ انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ دوستوں کو بھی ساتھ لاتے تھے۔

ایک روز میرے بڑے بھائی نے میرے خاوند سے کہہ ہی دیا — "بھائی جان! میرے ساتھ اُونچے خاندانوں کے لڑکے آتے ہیں۔ مجھے یہ بتاتے شرم آتی ہے کہ یہ میری بہن کا گھر ہے۔" اس طرح کی کوئی نہ کوئی طنزیہ سی بات وہ ضرور کہہ جاتے لیکن ایسی بے تکلفی سے کہتے جس میں ہنسی مذاق کا رنگ ہوتا تھا۔ میرے خاوند ہنس دیا کرتے تھے۔

میں جانتی تھی کہ انہوں نے بات کو ہنس کر ٹالا نہیں بلکہ یہ تیر اُن کے دل میں اُترتے جا رہے ہیں۔ میں اُن کا دل رکھنے کی کوشش کرتی تھی اور یہاں تک کہہ دیا کرتی تھی کہ میرے باپ اور بھائیوں کی باتوں کو دل میں نہ بٹھاؤ، وہ شو باز لوگ ہیں، اور اس عادت کی وجہ سے میں نے انہیں کبھی بھی پسند نہیں کیا۔

انہیں یہ اعتبار آگیا تھا کہ میں انہیں دل و جان سے چاہتی ہوں اور میں اُن کے ساتھ فاقے کرنے کو بھی تیار ہوں لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ یہ سوسائٹی اور برادری صرف اُسے اچھا کہتی ہے جو اُس کے مطالبات پُورے کرے، چاہے اُسے اپنی بیوی کو طلاق دینی پڑے۔ سسرال اور دیگر رشتہ دار کسی میاں بیوی کو خوش دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔ انہیں اس سے غرض ہوتی ہے کہ دونوں مل کر انہیں کتنا کچھ خوش رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر میاں بیوی میں ناچاقی تک پیدا کر دیا کرتے ہیں۔

ایک روز انہوں نے کہا — "میری شادی تمہارے ساتھ نہیں ہوئی، تمہارے رشتہ داروں کے ساتھ ہوئی ہے۔"

ایک روز میری ماں نے بھی میرے خاوند سے کہہ دیا — "ہم نے گاؤں میں تمہاری بہت عزت بنائی ہوئی ہے لیکن ہمارے رشتہ دار تمہارے گھر آتے ہیں تو واپس جا کر طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ تم یوں کرو کہ پرانا مکان بیچ کر ایک گاڑی لے لو۔ گاؤں میں آؤ تو گاڑی پہ آؤ اور کوٹھی کے دو تین کمرے اور بنا لو۔ رشتہ داروں کی خاطر تواضع دل کھول کر کیا کرو۔"

کہتے ہیں کہ ماں بیٹی ہمراز اور ایک دوسری کی غمخوار ہوتی ہیں مگر میری ماں غمخوار ماؤں میں سے نہیں تھی۔ وہ بڑھاپے میں بھی نئی دلہنوں کی طرح سارے زیورات لٹکا کے آیا کرتی تھی۔ اس نے کبھی میرے دل کی بات نہیں سنی تھی۔ یہ شوبازی ہمارے ملک کی بہت سی عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ غریبوں میں بھی اور امیروں میں بھی نمائش کا شوق ہے۔ امیر عورتوں میں تو شوبازی کا خبط ہوتا ہے۔ میری کوٹھی کے اردگرد کوٹھیوں کی عورتیں میرے گھر آیا کرتی تھیں۔ بڑ ہانکنے اور اپنی امیری کا پرچار کرنے کے سوا کوئی بات نہیں کرتی تھیں۔ میں کبھی کسی کے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ تو غیر تھیں۔ انہیں اس سے کیا کہ مجھے ابھی اس چھوٹی سی کوٹھی کا قرض ادا کرنا ہے۔ افسوس تو اس پہ آتا تھا کہ میری سگی ماں بھی میرے پاس شو مارنے آتی تھی اور میرے گھر کے سامان میں کیڑے نکالتی تھی۔ یہ تو اس نے کئی بار کہا تھا "اگر تمہارا جہیز اتنا نہ ہوتا تو اس گھر میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔"

میں اسے یہ بتانے سے ڈرتی تھی کہ پانچ سو تنخواہ میں سے دو سو روپے قرض کی قسط کٹ جاتی ہے اور باقی تین سو میں سے ماں کے علاج کا خرچ اور دو گھروں کی دال روٹی پوری کرنی پڑتی ہے۔ اگر میرے والدین اور بھائیوں میں سفلہ پن کی بجائے خلوص ہوتا تو میرے سارے مسئلے حل ہو جاتے مگر انہوں نے میری جدوجہد کو اور زیادہ مشکل بنا دیا تھا۔ میرا مسئلہ دُہرا ہو گیا تھا۔ گھر میں بچت کرنا اور اپنے رشتہ داروں سے چھپائے رکھنا۔

میرے بھائیوں نے میرے خاوند کی بہنیں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ پرانے مکان میں رہتی تھیں۔ ایک روز بڑی بہن میرے پاس آئی ہوئی تھی۔ چھوٹی اپنی ماں کی خاطر نہیں آئی تھی۔ دونوں بہنیں خوبصورت تھیں۔ رنگ بھی صاف ستھرے تھے۔ اسی روز میرا بڑا بھائی آ گیا۔ اس نے پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا۔ لڑکا اسے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس نے لڑکی کے ساتھ بڑی جلدی ہی بے تکلفی پیدا کر لی۔ لڑکی اس لیے اس کے ساتھ کھل گئی کہ وہ میرا بھائی تھا۔

بھائی نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی اسے بہت ہی پسند آئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ تمہارے لیے رشتے تلاش کیے جا رہے ہیں۔ امی اور ابا سے کہو کہ وہ پسند کریں تو میں یہ رشتہ کروا دوں گی۔ بھائی بہت خوش ہوا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا تو اس نے شرما کے کہا کہ کروا دو۔ وہ پردہ دار لڑکی تھی۔ میرا بھائی چلا گیا۔

دو روز بعد میرا باپ آیا۔ میرا خاوند گھر تھا۔ باپ نے ان کی بہن کے رشتے کی بات کی۔ میرے خاوند نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "ہو جائے تو اچھا ہے۔"

خاوند میری کسی بات کو رد نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے "ہاں" کہہ دی۔

میرے باپ نے پوچھا — "تم شادی کے لیے کب تک تیار ہو جاؤ گے؟

میرا خیال ہے کہ تین ماہ کے اندر اندر ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"تین سال کی بات کریں۔" میرے خاوند نے کہا۔

"تین سال؟" میرے باپ نے حیران ہو کے پوچھا۔ "اتنا عرصہ کیوں؟ میں اتنا عرصہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

"کیا آپ جہیز کے بغیر میری بہن کو قبول کر لیں گے؟" خاوند نے کہا۔ "مجھ پر کچھ اور بوجھ بھی ہیں۔"

"جہیز کے بغیر بہن کو گھر سے نکالتے شاید تمہیں شرم نہ آئے، میں ڈوب مروں گا۔" باپ نے کہا۔ "میں لڑکی کو اپنے گھر نہیں، گاؤں اور ساری برادری کے سامنے لے جاؤں گا۔ لڑکی خواہ کانی اور بھینگی ہو، جہیز اتنا ہو جتنا میں نے اپنی بیٹی کو دیا تھا۔ بارات چار پانچ سو آدمیوں کی ہوگی۔ سوچ لو۔"

میں نے اپنے باپ کی مخالفت کی تو بوڑھا مجھ پر برس پڑا۔ کہنے لگا۔ "تم بچپن سے مجھے ذلیل کر رہی ہو۔ تم جب محل میں رہتی تھیں تو تمہیں جھگی ہی پسند آتی تھی۔"

میرا خاوند ہنسنے مسکرانے والا آدمی تھا۔ مجھے اُن کا ہلکا مذاق بہت پسند آتا تھا۔ ہمارے گھر میں فارغ البالی نہیں تھی، پھر بھی ہم خوش رہتے تھے اور پیسہ پیسہ بچانے کی کوشش کرتے تھے مگر اس گفتگو کے بعد ان کی ہنسی اُداس ہو گئی۔ انہیں غالباً پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ بہنوں کے لیے جہیز نہ بنا سکے تو بہنیں گھر بیٹھی بوڑھی ہو جائیں گی۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ ضروری نہیں کہ ان کی بہن کا رشتہ میرے بھائی کے ہی ساتھ ہو گا۔ اپنی حیثیت کا کوئی گھرانہ دیکھ لیں گے، مگر میں

اُن کی اُداسی ختم نہ کر سکی۔

اُس وقت تک انہیں میرے والدین اور میرے بھائیوں کی طرف سے بہت چوٹیں پڑ چکی تھیں۔ میں اُن کے کس کس زخم پر مرہم رکھتی۔ ایک مشکل میرے بھائی نے پیدا کر دی۔ اُس نے تین چار روز بعد آ کر بتایا کہ میرے باپ نے یہ رشتہ نامنظور کر دیا ہے۔ میرا بھائی اسی لڑکی کو چاہتا تھا۔ اُس نے ماں کو راضی کر لیا لیکن سوال جہیز کا اور دیگر اخراجات کا تھا۔ بھائی نے باپ پر زور دیا کہ وہ اسی لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ باپ بیٹے میں تُو تکار بھی ہوئی۔ باپ نے اولاد کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اب دونوں لڑ کے منہ پھٹ ہو گئے تھے۔ باپ نے بیٹے کی ضد اور گھر سے چلے جانے کی دھمکی سے مرعوب ہو کر کہا کہ شہر جاؤ اور اپنی بہن سے کہو کہ لڑکی کا جہیز ہم در پردہ بنوا دیں گے، تم فکر نہ کرو اور شادی کی تیاری کرو۔ بھائی یہی بات کہنے آیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ یہ بات میرے خاوند کو کھا جائے گی۔ میں نے بھائی کو سختی سے منع کیا کہ وہ ان سے ایسی بات نہ کہے مگر وہ باز نہ آیا۔ ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہ دفتر سے آ گئے۔

"بھائی جان میں نے آپ کی مشکل آسان کر دی ہے"۔ میرے بھائی نے اوچھے سے لہجے میں میرے خاوند سے کہا۔ "ابا جان نے کہا ہے کہ جہیز ہم خود آپ کو بنوا دیں گے کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ آپ لسٹ دے دیں۔ ہم پچاس ہزار تک خرچ کر دینگے۔"

میرے خاوند کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ انہیں کبھی غصہ نہیں آیا تھا۔ شاید انہوں نے غصے کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اشارے سے دوسرے کمرے میں چلنے کو کہا۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں گئی۔ اُن کی زبان کانپ رہی تھی۔

میں اُن کے مزاج سے واقف تھی۔ کہنے لگے "اپنے بھائی سے کہہ دو کہ میں نے بہنیں بیچنے کے لیے نہیں پالیں۔ جب بھی ہمت ہوئی تھوڑا سا جہیز بنا کر کسی غریب خاندان میں رشتہ دے دوں گا۔ بھائی سے کہو کہ میں رشتہ نہیں دوں گا۔" وہ چُپ ہو گئے اور اس کمرے میں نہیں گئے جہاں میرا بھائی بیٹھا ہُوا تھا۔

میں نے اسے کہا کہ وہ چلا جائے اور لڑکی کو دل سے اُتار دے۔ بھائی کی کھوپڑی میں عقل کی جگہ امیری بھری ہُوئی تھی۔ وہ جلنے کی بجائے میرے خاوند کے پاس چلا گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے گئی۔ وہ انہیں منانے اور جہیز کے لیے پچاس ہزار روپیہ قبول کر لینے پر آمادہ کر رہا تھا۔ وہ نہیں مان رہے تھے۔ انہوں نے تنگ آکر میرے بھائی کو ڈانٹ دیا میرے بھائی نے کہا — "جہیز کے بغیر اُسے کہاں دو گے؟ ساری عمر گھر بٹھائے رکھو گے۔ میں دیکھوں گا اُسے کون قبول کرتا ہے۔" اور وہ چلا گیا۔

ایک مہینے بعد میری چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ ہمارے پاس زیادہ دینے کے لیے پیسے نہیں تھے مگر رسم و رواج کے مطابق بہن اور بہنوئی کے ذمّے جہیز کا آدھا نہیں تو تیسرا حصّہ ضرور آتا تھا۔ ہم اتنا نہیں دے سکتے تھے۔ میں نے گلے کا ہار بیچ ڈالا۔ کچھ خاوند نے قرض لیا۔ بہن کے لیے کپڑے وغیرہ خرید سے، اور جب یہ چیزیں لے کے شادی پر گاؤں گئے تو میری ماں نے مجھے اور میرے خاوند کو طعنے دینے شروع کر دیئے۔ اُن کی نگاہ میں یہ رسم و رواج کے مطابق بہت تھوڑا سامان تھا۔

ماں نے میرے خاوند سے کہا — "میں تو برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ لوگ خاص طور پر دیکھیں گے کہ بہنوئی کیا لایا ہے۔"

ہم تو پانی پانی ہو گئے۔ میری ماں کی نظروں میں داماد کی قیمت یہی تھی کہ وہ

رسم و رواج میں پُورا اُتر کر اس کی ناک اُونچی کرتا ہے یا نہیں۔ مگر میری ماں بھی مجبور تھی۔ یہ رواج اُس نے تو نہیں بنایا تھا۔ وہ بھی اس کی پابند تھی۔ مختصر یہ کہ ہم نے یہ بے عزتی بھی برداشت کی۔

اُس روز کے بعد میرے خاوند پر خاموشی چھا گئی۔ وہ اُداس اُداس رہنے لگے۔ ہم تو پہلے قرضے ادا کرنے کی سوچ رہے تھے مگر برادری نے قرض میں اضافہ کر دیا۔ میں نے انہیں ایک بار پھر کہا کہ کوٹھی کرائے پر دے دیں۔ انہوں نے بڑے غصّے میں جواب دیا۔ "پھر تمہارے والدین مجھے اپنے گاؤں میں بھی داخل نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے تمہارا رشتہ مجھے نہیں دیا اس کوٹھی کو دیا تھا۔"

دن گزرتے چلے گئے۔ ایک روز میرے خاوند نے مجھے دو ہزار روپیہ دیا اور یہ خوشخبری سُنائی کہ انہیں ترقی مل گئی ہے اور ان کی تنخواہ نو سو روپے ہو گئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ترقی پچھلی تاریخ سے ملی ہے۔ یہ دو ہزار روپیہ پچھلا بقایا ملا ہے۔

میں نے انہیں کہا — "آپ نے میرا رشتہ حاصل کرنے کے لیے جھُوٹ بولا تھا کہ آپ کی تنخواہ نو سو روپے ہے۔ خدا نے آپ کی سُن لی ہے" — میں نے پورے ایک سو نفل پڑھے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے خاوند کی ایمانداری اور میرے خلوص کو قبول کر لیا اور انعام سے نوازا ہے۔ میں نے انہیں دو ہزار روپیہ واپس دے کر کہا کہ جہاں سے آٹھ ہزار روپیہ قرض لیا تھا وہاں ادائیگی کر دیں۔ انہوں نے ادائیگی کر دی اور رسید مجھے دے دی۔

ڈیڑھ مہینے بعد انہوں نے مجھے ساڑھے تین ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ ایک

نئے حکم کے تحت انہیں سال بھر کا بونس ملا ہے اور اگلے دن کوٹھی کے سامنے ایک کار آکر رُکی۔ مَیں سمجھی کہ میرے بھائی آئے ہیں۔ باہر نکلی تو میرے خاوند کار میں سے نکل رہے تھے۔ انہوں نے ہنس کر کہا — "لو، تمہارے لیے کار بھی لے آیا ہوں"۔

یہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی تھی۔ مَیں نے قیمت پوچھی تو انہوں نے دس ہزار بتائی۔ مَیں نے پوچھا کہ قیمت کہاں سے ادا کی ہے تو انہوں نے بتایا کہ ایک دوست انگلینڈ چلا گیا ہے۔ گاڑی مجھے دے گیا ہے۔ کہہ گیا ہے کہ دس ہزار پر رکھ لو اور ہر مہینے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کراتے رہنا۔ جب کبھی دس ہزار پورے ہو جائیں گے تو مَیں لے لوں گا..... مجھے خوشی ہوئی کہ برادری میں خصوصاً میرے والدین کے ہاں میرے خاوند کا رُعب داب قائم ہو جائے گا مگر افسوس بھی ہوا کیونکہ اب کار کی قسط بھی سر چڑھ گئی تھی۔

اس کار نے ہماری عزت بحال کر دی۔ وہ کہنے لگے کہ آؤ گاؤں چلیں مَیں اُن کے ساتھ گاؤں گئی تو میرے ماں باپ کار دیکھ کر پھُولے نہیں سماتے تھے۔ انہوں نے سارے گاؤں میں یہ خبر پھیلا دی کہ ہماری بیٹی نے کار خریدی ہے۔

مگر مَیں اپنی ساس کے پاس گئی تو کار میرے لیے لعنت بن گئی۔ ساس نے کہا۔ "وہ کوٹھی کرائے پر چڑھنے سے گئی۔ اب تم یہ حویلی بھی نیلام کراؤ گی۔ اس کے باپ کو تو سائیکل بھی نصیب نہیں ہوئی تھی"۔ خاوند کی بہنوں نے بھی خفگی کا اظہار کیا۔ تب مَیں نے بھی محسوس کیا کہ ہمیں کار نہیں لینی چاہیے تھی۔

مَیں نے خاوند سے کہا کہ کار رکھنی ہے تو کوٹھی کرائے پر دے دو۔ انہوں نے کہا — "ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ دے رہا ہے"۔

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے کہ اللہ نے دینا شروع کر دیا تھا۔ خاوند کے چہرے سے اُداسی ڈھل گئی تھی۔ وہ اب بے چین بھی نہیں رہتے تھے۔ انہوں نے ایک روز میرے بہنوئی (میری چھوٹی بہن کے دولہا) کو دعوت دی۔ میرے والدین اور بھائیوں کو بھی مدعو کیا اور اس قدر خرچ کیا کہ میرے رشتہ دار تو خوش ہو گئے لیکن مجھے یہ عیاشی پسند نہ آئی۔

پھر میرے خاوند نے شام چار ساڑھے چار بجے کی بجائے رات ساڑھے سات اور آٹھ بجے گھر آنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے مہینے بعد نو سو روپے کی بجائے دو ہزار روپے دیئے اور بتایا کہ اب مَیں اوورٹائم کام کرتا ہوں جس سے یہ تنخواہ بنی ہے۔ کوٹھی کے قرضے کی دو سو روپیہ قسط اور اڑھائی سو روپیہ دوسرے قرض کی قسط دے دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک گھنٹہ اور لیٹ آنا شروع کر دیا اور مجھے بتایا کہ دو سو روپے ماہوار کا پارٹ ٹائم کام اور مِل گیا ہے۔

انہوں نے گھر میں وہی نوکرانی پھر بُلا لی اور باورچی خانہ اُس کے حوالے کر دیا۔ اب آمدنی تو بہت ہو گئی تھی جس سے قرضوں کی قسطیں ادا کرنے کے علاوہ مَیں نے اُن کی بڑی بہن کی شادی کے لیے کپڑے بھی خریدنے شروع کر دیئے لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ وہ صبح کے نکلے ہوئے رات ساڑھے نَو بجے گھر آتے تھے۔ لیکن اتنا کام کرنے کے باوجود وہ خوش اور مطمئن رہتے تھے۔

اور شادی کا آٹھواں مہینہ آگیا۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ کار کا حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ مجھے ایسا تو کوئی وہم ہی نہیں

تھا کہ وہ کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ اُن میں کوئی بُری عادت نہیں تھی۔ وہ سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے۔ صاف گو، حقیقت پسند اور دیانت دار تھے۔ جس رات انہیں ماں کو دیکھنے جانا ہوتا مجھے بتا جایا کرتے تھے کہ رات دیر سے آؤں گا۔ اُس رات وہ دس بجے تک نہیں آئے تھے۔ مَیں نے اپنے آپ سے یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ ماں اور بہنوں کو دیکھنے چلے گئے ہوں گے۔ مَیں نے سوچا کہ انہوں نے اچھا کیا ہے کہ اُدھر چلے گئے ہیں۔

ساڑھے دس بھی بج گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ کار کی آواز آئی اور بڑی زور سے بریکیں لگیں جیسے کار کی رفتار بہت تیز تھی اور انہوں نے اچانک بریکیں لگائی ہوں۔ مَیں دوڑتی ہوئی دروازے پر گئی۔ ابھی دروازہ کھولا بھی نہیں تھا کہ میرے خاوند نے زور سے دروازہ کھولا اور اندر آکر چٹخنی چڑھا دی۔ وہ بہت ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوٹ کی باہر والی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پیکٹ سا نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ "کہیں چھپا دو"

مَیں نے پیکٹ لے لیا اور پُوچھا کہ کیا ہُوا ہے مگر وہ پسینہ پسینہ ہُوئے جا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اُن کے منہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ آپ میری حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

وہ ابھی کچھ بتانے بھی نہیں پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اُٹھ کر دروازہ کھولنے کی بجائے اور زیادہ گھبرا گئے۔ مَیں دروازہ کھولنے کے لیے اُٹھی تو انہوں نے میرا بازو پکڑ لیا اور اُٹھ کر میرے کان میں کہا —— "مَیں باہر نکل جاؤں تو دروازہ کھولنا۔ انہیں بتانا کہ مَیں گھر نہیں ہوں" —— وہ لڑکھڑاتی زبان میں

یہ کہہ کر پچھلے دروازے کی طرف چل پڑے۔

میرے ہاتھ میں انہوں نے جو پیکٹ دیا تھا وہ مَیں نے صوفے پر پھینک دیا اور دروازہ کھولنے کی بجائے اُن کے پیچھے چلی گئی۔ وہ پچھلے دروازے سے نکلے اور دوسری طرف سے کوٹھی کے سامنے جانے کو چلے مگر نکڑ پر رُک کر ذرا سا آگے ہو کے دیکھنے لگے۔ وہ دبے پاؤں آگے کو چل پڑے۔ مَیں بھی اُن کے ساتھ گئی۔ کار دو تین قدم دُور کھڑی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے دو تین آدمی دوسری طرف سے کوٹھی کے پچھواڑے گئے ہیں۔ میرے خاوند اپنی کار میں بیٹھے۔ مجھے کہا —— "تم یہیں رہو"۔ مگر مَیں اس قدر خوفزدہ ہو چکی تھی کہ کوٹھی میں اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔ مَیں نے کار کا دُوسرا دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

انہوں نے گاڑی سٹارٹ کی اور بڑی ہی تیزی سے پیچھے کر کے گیٹ کی طرف موڑی۔ مجھے آوازیں سُنائی دیں —— "نکل گیا۔ جلدی آؤ" —— اور ہماری گاڑی گیٹ سے نکل گئی۔ گیٹ کے ساتھ ایک اور گاڑی کھڑی تھی۔ میرے خاوند نے گاڑی دائیں طرف گھمائی اور سڑک پر ہو گئے۔ مَیں نے پیچھے دیکھا۔ کار جو ہمارے گیٹ کے ساتھ کھڑی تھی چل پڑی اور ہمارے پیچھے آئی۔ خوف سے میرا دل کانپنے لگا۔ مَیں انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پُوچھ رہی تھی کہ یہ کیا معاملہ ہے لیکن وہ سامنے دیکھ رہے تھے۔ بولتے نہیں تھے۔ رفتار اتنی تیز کہ میرے ڈر میں اضافہ ہو رہا تھا۔

پچھلی کار ہمارے پیچھے تھی۔ میرے خاوند نے جس طرح موڑ کاٹے ان سے کار کا نہ اُلٹنا معجزہ تھا۔ تھوڑی سی دیر میں کار شہر سے نکل گئی مگر پچھلی کار نے دُور نہ جانے دیا۔ وہ ہماری گاڑی کے پہلو کے ساتھ آ گئی۔ پھر ذرا سا آگے ہو گئی۔ کسی نے اُس

کار سے ہاتھ باہر نکالا۔ اس ہاتھ میں پستول تھا۔ مجھے آواز سُنائی دی "رُک جاؤ ورنہ گولی چلا دیں گے"۔

میرے خاوند نے گاڑی روک لی۔ دوسری گاڑی اس کے آگے رُکی۔ میں نے اپنی گاڑی کی روشنی میں دیکھا کہ کار میں سے پولیس کے تین آدمی نکلے۔ وہ وردی میں تھے۔ دو آدمی سادے کپڑوں میں تھے۔ ایک پولیس آفیسر نے پستول آگے کر کے میرے خاوند کو گاڑی سے باہر نکال لیا اور مجھے بھی باہر آنے کو کہا۔ میں بے ہوش نہیں ہوئی باقی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ دوسرے پولیس والے نے ہماری گاڑی میں ٹارچ کی روشنی سے دیکھا اور کہا "ریوالور اندر پڑا ہے"۔

سب اُدھر گئے۔ پھر میرے خاوند کو گاڑی کی طرف لے گئے۔ میں بھی گئی۔ ہماری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پستول پڑا تھا۔ تب میرے خاوند نے بولنا شروع کیا اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ یہ ریوالور اُن کا نہیں۔ پولیس نے میرے خاوند کو اور مجھے اپنی کار میں بٹھا لیا اور ہماری کار کے سٹیئرنگ پر پولیس آفیسر بیٹھ گیا۔ دونوں کاریں واپس چل پڑیں اور ہماری کوٹھی میں آئیں۔

گھر کی تلاشی لی گئی۔ میں نے اپنے خاوند کا دیا ہوا بیگ صوفے پر پھینک دیا تھا۔ وہ صوفے پر ہی پڑا تھا۔ پولیس نے کھول کر دیکھا اس میں سے سَو سَو روپے اور پچاس پچاس روپے کے نوٹ برآمد ہوئے۔ اُن کے بتانے پر پتہ چلا کہ یہ رقم بیس ہزار ہے۔ میرے متعلق پولیس نے بڑی مشکل سے یقین کیا کہ میں ان کی بیوی ہوں۔ پولیس آفیسر نے مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر اتنے سوال اور ایسے ایسے سوال کیے کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے انہیں اپنے باپ کا نام بتایا،

گاؤں کا نام بتایا اور بہت کچھ بتا کر اُن کی تسلی کی۔

میں نے پولیس آفیسر سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے اتنا ہی بتایا کہ میرے خاوند نے کسی گاؤں میں ایک آدمی کو ریوالور کی گولی سے زخمی کر دیا ہے اور گاؤں میں بہت سی گولیاں چلائی ہیں۔ وہ اس گاؤں میں کسی سے رشوت کی رقم لینے گئے تھے جو انہوں نے وصول کر لی تھی لیکن کوئی جھگڑا ہو گیا جس میں میرے خاوند نے ریوالور استعمال کیا۔ وہ ریوالور ہماری کار کی پچھلی سیٹ پر پڑا ملا اور رشوت کی رقم ہمارے گھر سے برآمد ہوئی۔

میرے خاوند کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی اور میں اُجڑ گئی۔ ایسی دہشت، ایسا خوف اور ایسا غم کہ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ میں حالات کا مقابلہ کر رہی تھی.... میں فاقہ کشی کے لیے بھی تیار تھی مگر اس حادثے کے متعلق تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ رشوت، ریوالور، پولیس اور گرفتاری.... نہیں! یہ سب جھوٹ تھا۔ ڈرا دینے والا خواب تھا۔ میرا خاوند اس چکر میں پڑنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ دیانتدار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے محکمے میں رشوت کے دریا بہتے ہیں۔ اگر وہ رشوت لینے والے ہوتے تو کوٹھی قرض لے کے نہ بناتے، شادی پر قرض نہ لیتے، بہنوں کا جہیز بنانے کے لیے پریشان نہ ہوتے اور برادری میں بدنام نہ ہوتے۔ یہ کوئی غلط فہمی تھی، بہت بڑی غلط فہمی ـــ مگر میری سُننے والا کوئی نہ تھا۔ میں گھر میں اکیلی اور رات بڑی ہی ڈراؤنی تھی۔

پولیس ہماری کار بھی ساتھ ہی لے گئی تھی۔ میں باقی رات سو نہیں سکی۔ روتے اور کانپتے صبح ہو گئی۔ نوکرانی صبح سویرے آ جایا کرتی تھی۔ وہ آئی تو میں گھر اس کے

حوالے کرکے گاؤں چلی گئی۔ اپنے ماں باپ کو بتایا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ باپ نے میرے خاوند کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے یہ یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ وہ اس قسم کا جرم نہیں کر سکتے۔ میرے باپ کو اعتبار آیا یا نہیں، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ البتہ وہ ہماری مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی وقت میرے ساتھ چل پڑے۔

مجھے گھر چھوڑ کر تھانے چلے گئے۔ اب تو پولیس اور عدالتوں کا بڑا لمبا چکر تھا۔ یہ ایک یا دو دنوں میں ختم ہونے والا معاملہ نہیں تھا۔ انہیں چودہ روز تھانے کی حوالات میں رکھا گیا۔ پھر جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ آٹھ دس روز بعد انہیں ضمانت پر رہا کرا لیا گیا۔ وہ گھر آئے تو اُن کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ رنگ زرد تھا اور انسان جس حد تک پریشان ہو سکتا تھا وہ اس حد سے کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔

ایک دن اور رات تو میری ماں، باپ اور بھائی میرے گھر رہے، اُن کے سامنے میرے خاوند یہی کہتے رہے کہ وہ بے گناہ ہیں اور کسی اور کے دھوکے میں انہیں پکڑ لیا گیا ہے۔ میرے رشتہ دار چلے گئے تو میں نے اُن سے پوچھا۔ یہ غلط فہمی کس طرح پیدا ہوئی کہ ریوالور اُن کی گاڑی میں پڑا ہوا تھا اور وہ گھر بیس ہزار رقم لا رہے تھے۔ میں یہ مان سکتی ہوں کہ کسی نے ریوالور اُن کی گاڑی میں پھینک دیا تھا لیکن ان کے ہاتھ میں یہ رقم کس طرح آ گئی تھی؟

"یہ رشوت کی رقم تھی" میرے خاوند نے اپنی صاف گوئی کی عادت کے مطابق کہا۔ "یہ رشوت میں نے لی تھی۔ اس میں سے آٹھ ہزار میرا حصہ تھا اور چھ چھ ہزار اپنے دفتر کے دو آدمیوں کو دینے تھے۔"

"رشوت؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "آپ نے رشوت لی تھی؟"

"ہاں۔" انہوں نے کہا۔ "میں نے رشوت لی تھی اور میں نے رشوت پہلی بار نہیں لی۔ میں پچھلے چار مہینوں سے رشوت لے رہا ہوں۔ اور سرکاری کاغذوں میں ردّوبدل اور جعلسازی کر رہا ہوں۔ میری کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے کوئی بونس نہیں ملا تھا۔ میں نے کبھی اوور ٹائم اور پارٹ ٹائم کام نہیں کیا تھا۔ تمہیں جو زائد پیسے دیتا رہا ہوں وہ سب رشوت کی رقمیں تھیں۔ ثابت کرنے کے لیے کہ میں اوور ٹائم پارٹ ٹائم کرتا ہوں، دفتر سے چار بجے اُٹھ کر ادھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا اور رات دیر سے گھر آتا تھا۔"

میں حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ وہ آدمی نہیں جسے میں بڑے فخر سے اپنا خاوند کہتی رہی ہوں۔ مجھے ان کی ایمانداری ہی اچھی لگی تھی۔ انہوں نے مجھے حیرت زدہ دیکھ کر کہا۔ "میں نے رشوت نہ لینے کی قسم کھا رکھی تھی لیکن تمہارے والدین نے، تمہارے بھائیوں نے اور اس بدبخت برادری نے میری قسم توڑ دی۔ میں اپنی ماں کو خوش کرنے کے لیے تمہارے گھر رشتہ مانگنے گیا تھا۔ اپنی بیمار ماں کو میں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر میں اپنی مرضی سے فیصلہ کرتا تو کسی اپنے جیسے گھرانے میں شادی کرتا اور اس سے پہلے اپنی بہنوں کی شادیاں کرتا مگر ماں بزرگوں کی رشتہ داریاں قائم رکھنا چاہتی تھی۔ مجھے تمہارا رشتہ حاصل کرنے کے لیے تنخواہ زیادہ بتانی پڑی اور کوٹھی کا رُعب جمانے کے لیے کرائے سے محروم رہا....

"میں نے سوچا یہ تھا کہ شادی کے بعد جب تمہارے ماں باپ کے دلوں میں میری

جگہ بن جائے گی تو انہیں اپنی اصل مالی حیثیت بتا دوں گا اور کوٹھی کرائے پر دے دوں گا مگر انہوں نے یہ بھی برداشت نہ کیا کہ تم اپنے ہاتھوں کھانا پکاؤ۔ پھر مجھے جو طعنے دیئے گئے وہ تمہارے سامنے دیئے گئے۔ تمہارے بھائیوں نے میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ بھی تمہیں معلوم ہے۔ لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہارے والدین اور بھائیوں نے مجھے ساری برادری میں ذلیل کر دیا تھا۔ مجھے برادری کے تین چار آدمیوں نے بتایا کہ مجھے بدنام کیا جا رہا ہے۔ میں نے صرف تمہاری خاطر برداشت سے کام لیا۔ تم میرے ساتھ تھیں تو میں نے دل سے کہا کہ ساری دنیا میرے ساتھ ہے لیکن تم اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ میں نے اپنے سر لے لیا تھا.....

"میں نے برادری کی ساری لعنتیں برداشت کیں مگر مجھے جب میری بہن کی قیمت پیش کی گئی تو میرا دل یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔ تمہارے بھائی نے یہ کہہ کر کہ جہیز کے بغیر بہن کس کو دو گے، میری ایمانداری کو اتنا زخمی کر دیا کہ میں تنہائی میں جا کر لہو کے آنسو رویا۔ میرے سامنے دونوں بہنیں آگئیں جنہیں میں جہیز دینے کے قابل نہیں تھا۔ ان کی قسمت میں ساری عمر گھر بیٹھے رہنا لکھا تھا۔ مجھے ماں یاد آگئی جس کا علاج پیسوں کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ کوٹھی کا قرض اور شادی کا قرض یاد آگیا اور یہ احساس بھی میرے دل میں جاگ اٹھا کہ پاس پلّے کچھ ہوگا تو برادری میں عزّت بنے گی۔ کار ہو گی تو تمہارے شوبازی والدین اور سِفلے بھائی میری قدر کریں گے۔"

انہوں نے مجھے وہ تمام طعنے یاد دلائے جو برادری نے اور میرے رشتہ دار

نے انہیں دیئے تھے۔ یہ توپوں کے گولے تھے، بم تھے جو ایک آدمی کے ایمان پر گرتے رہے اور ایمان کے پرخچے اُڑ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "پھر میں ایمان سے دستبردار ہو گیا۔ میرے پاس چار پانچ کیس رُکے پڑے تھے۔ وہ لوگ شروع سے ہی رشوت پیش کر رہے تھے لیکن میں نہیں لے رہا تھا۔ میں اُن کے اور اپنے صاحب کے درمیان چٹان بنا ہُوا تھا۔ میں نے انہیں گھر بلایا اور رشوت لے کر اُن کے کام کر دیئے۔ صاحب بہادر کو بھی حصّہ دیا۔ ہیڈ کلرک ہینڈ کا رہی میں سے ایک نے سستے داموں دلوائی تھی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ آخر ایک دن یہ کیس آگیا۔ یہ زمین کے قبضے کا معاملہ تھا۔ بیس ہزار روپیہ رشوت کا سودا تھا۔ اس کے ہم تین حصّہ دار تھے۔ رقم ایک گاؤں میں سے جا کر لینی تھی۔ وہیں جا کر کاغذی کارروائی کرنی تھی۔ یہ کام میرے سپرد کیا گیا۔ میں اپنی کار میں اس گاؤں میں گیا۔ یہ گاؤں شہر کے قریبی مضافات میں ہے....

"جاتے ہی میں نے کام کر دیا۔ دوسری پارٹی نے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہنگامہ دب گیا۔ ہم باہر بیٹھے ہوئے تھے کہ گاؤں کی ایک جوان لڑکی ہمارے قریب سے گزری۔ میرے پاس بیٹھے ہُوئے ایک جوان آدمی نے لڑکی کو چھیڑا۔ لڑکی نے رُک کر ایک گالی دی اور تیز تیز چلتی وہاں سے غائب ہو گئی۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ اتنے میں دس گیارہ آدمی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اُٹھائے ہماری طرف آئے۔ ایک کے پاس دونالی بندوق تھی۔ یہ مخالف پارٹی کے لوگ تھے۔ انہوں نے میرے پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کو للکارا۔ ہم سب دوڑ کر اندر چلے گئے۔ ان آدمیوں نے دروازے پر کھڑے ہو کر گالیاں دیں۔ اِدھر سے بھی چند آدمی مقابلے

کے لیے نکلے.....

"مَیں اندر چھپا ہُوا تھا۔ مَیں بیس ہزار روپیہ وصول کر چکا تھا۔ باہر مجھے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اِدھر سے ریوالور فائر ہُوا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک گولی اُدھر سے چلتی تھی اور ایک گولی اِدھر سے چلتی تھی۔ وہ جوان جس نے لڑکی کو چھیڑا تھا، غالباً چھت پر چلا گیا تھا اور وہاں سے ریوالور فائر کر رہا تھا۔ باہر بہت ہی شور شرابا تھا۔ مَیں گھبرایا ہُوا تھا اور وہاں سے نکلنے کی سوچ رہا تھا....

"ان لوگوں نے جن سے مَیں نے بیس ہزار رقم لی تھی مجھے تین گھنٹے بعد وہاں سے نکالا۔ میرے ساتھ ریوالور والا جوان آدمی بھی نکلا۔ باہر خاموشی ہوتی جا رہی تھی اور اندھیرا گہرا تھا۔ مَیں چھپ چھپ کر دو آدمیوں کی راہنمائی میں اپنی کار تک پہنچا۔ یہ دونوں آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مَیں نے کار اسٹارٹ کی۔ مجھے تھوڑی دُور ایک اور گاڑی کی بتیاں نظر آئیں۔ مَیں نے جلدی سے کار چلائی اور کچی پگڈنڈی پر ہو گیا۔ پکی سڑک پر پہنچا تو مَیں نے دیکھا کہ جس گاڑی کی بتیاں مجھے نظر آئی تھیں وہ ادھر ہی آ رہی تھی۔ میرے پیچھے بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے مجھے کار روکنے کو کہا۔ مَیں نے کار روکی تو وہ دونوں اُتر گئے اور دوڑتے ہوئے سڑک سے دُور نکل گئے۔۔

"پچھلی گاڑی ابھی دُور تھی۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہونے لگا کہ یہ گاڑی میرا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ میرے قریب آ گئی۔ مَیں نے کار جدھر بھی موڑی وہ گاڑی میرے پیچھے رہی۔ مَیں نے رفتار تیز کر دی تو اُس نے بھی رفتار تیز کر دی۔ مَیں نے کار آہستہ کی تو وہ گاڑی بھی آہستہ ہو گئی۔ وہ لوگ، مجھے شاید میرے گھر میں آ کر پکڑنا چاہتے تھے۔

مَیں گھر آ گیا اور وہ گاڑی بھی ہماری کوٹھی کے سامنے آ کر رُک گئی۔ مَیں کار سے نکلا تو دیکھا کہ وہ ایک کار تھی اور اس میں سے ایک پولیس انسپکٹر اُتر کر گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔"

اس کے بعد جو ہُوا وہ مَیں نے آپ کو سُنا دیا ہے۔ مجھے آج تک خاوند نے نہیں بتایا کہ گاؤں میں جا کر انہوں نے کیا کام کیا تھا جس کی انہوں نے بیس ہزار رشوت لی تھی۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ مَیں نے آپ کو سُنا دیا ہے۔ ان کا کیس عدالت میں گیا۔ مجھے اتنا ہی پتہ چل سکا کہ ریوالور اُس جوان آدمی کا تھا۔ وہ میرے خاوند کی کار میں ایک اور آدمی کے ساتھ بیٹھ کر گاؤں سے بھاگا اور راستے میں دونوں اُتر گئے۔ ریوالور بلا لائسنس تھا اس لیے وہ میرے خاوند کی کار میں پھینک گئے۔ اس ریوالور سے گاؤں کا ایک آدمی زخمی ہو گیا تھا۔

دوسری پارٹی نے فوراً شہر خبر پہنچا دی۔ وہاں سے اس پارٹی کے آدمی اپنی کار پر گئے۔ پولیس ساتھ لے کر آ گئے۔ تھانہ دُور نہیں تھا۔ ریوالور والا بھی پکڑا گیا تھا لیکن اُس نے بیان دیا کہ اُس کے پاس ریوالور نہیں تھا۔ مخالف پارٹی کو معلوم تھا کہ میرا خاوند رشوت لینے گاؤں میں گیا تھا۔ بہرحال تفصیلات خواہ کچھ ہی تھیں اور حقیقت بھی کچھ اور تھی مگر میرا خاوند دو پارٹیوں کے تنازعے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ عدالت میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ میرے خاوند نے رشوت لی تھی اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ریوالور میرے خاوند کے قبضے میں تھا۔ یہ ریوالور بلا لائسنس تھا اور فائر بھی کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں ایک آدمی زخمی ہُوا تھا۔

تین اور آدمیوں کو بھی سزائیں ہوئیں مگر سب سے زیادہ سزا میرے خاوند کو ملی

آٹھ سال قید۔ میرا سہاگ لُٹ گیا۔ بے عزتی اتنی کہ مَیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ میرے ماں باپ اور بھائیوں نے مجھے کہا کہ مَیں اُن کے پاس آ جاؤں اور ایسے بدکردار اور مجرم خاوند کو بھول جاؤں لیکن مَیں اُن کے پاس نہ گئی۔ میرا خاوند یقیناً مجرم تھا لیکن وہ میرا خاوند تھا۔ اُس کا پہلا بچّہ میری کوکھ میں پرورش پا رہا تھا۔ مَیں یہ بھی جانتی تھی کہ میرا خاوند مجرم نہیں تھا۔ اُسے میرے والدین اور برادری کے طعنوں اور سلوک نے مجرم بنایا تھا۔ مَیں کوٹھی خالی کر کے خاوند کے پُرانے مکان میں چلی گئی۔

کار پولیس سے واپس ملی تو وہ مَیں نے بڑے بھائی سے کہہ کر آٹھ ہزار پہ بکوا دی۔ میری ساس نے مجھے بہت کوسا لیکن خاوند کی دونوں بہنوں نے میری نیّت سمجھ کر میرا ساتھ دیا۔ مَیں نے ان لڑکیوں کو اور اُن کی ماں کو مجبور کر دیا کہ وہ بالائی منزل پر چلی جائیں۔ مَیں ان کے ساتھ اُوپر رہنے لگی۔ نیچے والا حصّہ کرائے پر دے دیا۔ کوٹھی چار سو روپے اور حویلی کی پہلی منزل ڈیڑھ سو روپے کرائے پر چڑھ گئی۔

میری ماں نے، باپ نے اور بڑے بھائی نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ دوسرے تیسرے دن ان میں سے کوئی نہ کوئی آ جاتا اور مجھے مجبور کرتا کہ مَیں خاوند سے طلاق لے لُوں۔ انہوں نے مجھے سبز باغ دکھائے۔ کوٹھیوں اور کاروں والے امیر کبیر زمینداروں کے بیٹے دکھائے اور آٹھ سال کی بیوگی سے بھی ڈرایا۔ پھر مجھے اُٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں لیکن مَیں نے ان کی ایک نہ سُنی اور ایک روز مجھے اپنے باپ سے کہنا پڑا کہ آپ آئندہ یہاں نہ آیا کریں۔

میرا پہلا بچّہ پیدا ہُوا تو میری ماں آئی، باپ اور بھائی بھی آئے۔ ماں نے کہا

کہ چالیس روز پُورے کر کے مَیں گاؤں آ جاؤں۔ ماں نے جب یہ کہا — "برادری سَو سَو باتیں بنا رہی ہے کہ ان کی بیٹی یہاں کیوں نہیں آتی" — تو مَیں برادری کے نام سے جل اُٹھی۔ ماں بچّے کے لیے روپے اور کپڑے لائی تھی۔ مَیں نے وہ برادری پر لعنت بھیج کر واپس کر دیے۔ اس کے بعد وہ لوگ میرے لیے اور مَیں اُن کے لیے مر گئی۔

میرا آسرا خدا تھا اور خدا کے بعد میرا خاوند جسے مہینے میں دو بار جیل خانے کی سلاخوں میں سے دیکھ آیا کرتی تھی۔ ایک بار انہوں نے بھی مجھے کہا — "آٹھ سال ایک عمر ہوتی ہے۔ مَیں تمہیں اپنے ساتھ قید نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر چاہو تو مجھ سے آزاد ہو جاؤ۔"

مَیں انہیں کوئی جواب نہ دے سکی۔ میرے آنسو بہنے لگے اور مَیں نے صرف سر ہلا کر انہیں سمجھایا کہ وہ ایسی بات پھر کبھی نہ کہیں۔ اس کے بعد نہ انہوں نے کبھی ایسی بات کہی اور نہ اُن کے سامنے میرے آنسو نکلے۔ مَیں نے جذبات کو آٹھ سال کے لیے دفن کر دیا اور بڑی ہی جانکاہ حقیقت کے مقابلے میں ڈٹ گئی۔ ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ ایک بیمار اور بوڑھی ماں تھی اور ہم تین نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ان میں ایک معصوم بچّے کا اضافہ ہو گیا۔ ساڑھے پانچ سَو روپے ماہوار کرائے کے آ جاتے تھے۔ یہ ہم سب کے لیے بہت تھے۔ ان میں سے مَیں ایک سَو روپیہ کوٹھی کے قرض کی قسط بنک کو دے دیا کرتی تھی۔

ہمارے معاشرے میں کوئی کسی کو اچھا نہیں کہتا۔ بات کے بتنگڑ بنانے والے اور رسوا کرنے والے بہت ہیں۔ ہمیں بھی رُسوا کیا گیا۔ ہمیں پریشان بھی کیا گیا لیکن

کچھ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں۔ میں انہی کا ذکر کروں گی۔ ان میں ایک تو ہمارے حویلی والے کرائے دار تھے۔ بہت ہی اچھا خاندان تھا۔ اور دوسرے میرے خاوند کے ساتھ کام کرنے والے ایک صاحب تھے۔ ان دو خاندانوں نے ہمیں اس قدر جذباتی سہارا دیا کہ یہ احساس ہی مٹا دیا کہ ہم تنہا ہیں۔

انہی کی کوششوں سے میرے خاوند کی بڑی بہن کا رشتہ طے ہو گیا۔ یہ گھر ہماری برادری سے باہر کا تھا۔ ساس نے اور برادری کے بزرگوں نے مجھے برادری سے باہر نکلنے سے منع کیا لیکن میں نے لڑکی کو اپنے زیورات اور کپڑے دے کر اسے بیاہ دیا۔ کوئی جہیز نہیں تھا۔ لڑکے والے اچھے لوگ تھے۔ انہوں نے جہیز کے بغیر لڑکی کو قبول کر لیا۔ میں نے جیل میں اپنے خاوند کو یہ خوشخبری سنائی تو اُن کے آنسو بہنے لگے۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے اور اس ملاقات میں ہماری کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ اگلی ملاقات پر انہوں نے بتایا کہ یہ خوشی کے آنسو تھے۔

سات سال گزر گئے۔ آٹھ سال قید میں سے انہیں ایک سال معافی مل گئی تھی۔ وہ گھر آئے تو ان کا پہلا بچہ سات سال کا ہو چکا تھا۔ اور ان کی بہن کا پہلا بچہ ساڑھے تین سال کا ہو گیا تھا۔ میں نے کارکے آٹھ ہزار روپے بنک میں جمع کرا دیئے تھے۔ سات سال بعد یہ تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار ہو چکے تھے۔ اس رقم سے انہوں نے ایک دکان کر لی اور آج اللہ کا کرم ہے وہ دکان ہمیں ہزاروں روپے دے رہی ہے۔

✪ ✪

چار دیواری کا قیدی جب آزاد ہُوا

محلّہ مجھے عصمت فروش کہہ رہا تھا۔ نامعلوم افراد میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میرے پاس اتنے ہی پیسے تھے کہ چند دن دال روٹی چل سکتی تھی۔ میں نے سرکاری دفتروں کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔

عاصم زیدی

میں اپنی فیملی کے ساتھ ایک انگریزی پکچر دیکھنے گیا۔ پکچر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایک بیرا آیا۔ اس کی ٹرے میں کوکا کولا کی کھلی ہوئی چھ بوتلیں تھیں۔ اس نے ایک بوتل میرے بچے کے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے اسے کہا کہ نہ بھئی، نہیں چاہیے۔ بیرے نے دوسری بوتل میری بچی کے ہاتھ میں دے دی اور بولا —— "بل آپ نہیں دیں گے صاحب۔ یہ سب آپ کی فیملی کے لیے ہیں۔"

میں نے پوچھا —— "بل کون دے گا؟"

اس نے چار بوتلیں میرے چاروں بچوں کو دے دیں۔ میری بیوی نے بوتل نہ لی۔ بیرے نے کہا —— "آپ لے لیں۔ مجھے پیسے مل گئے ہیں" —— اور وہ ایک بوتل مجھے اور ایک میری بیوی کو دے گیا۔

میں ایسے محکمے میں تھا جہاں رشوت نہ لو تو حاجت مند بچوں کی جیبوں میں نوٹ ڈال جاتے تھے۔ میں نے بیوی سے کہا —— "پی لو۔ بوتلیں بھیجنے والا کل دفتر آجائے گا۔"

بوتل پیتے پیتے پکچر شروع ہو گئی۔ پکچر ختم ہوئی تو میں فیملی کو لے کے باہر نکلا۔ ایک شناسا صورت نظر آئی۔ میرے منہ سے نکل گیا۔

"ارے، تم؟ یہ بوتلیں تم نے بھیجی تھیں؟ زیادتی کی تھی یار! کہو کیسے ہو؟"

اس کے ساتھ ایک خاتون تھی۔ اس آدمی نے تعارف کرایا۔

"واقف ہے" —— میں اس آدمی اور اس کی بیوی کے کپڑے اور فیشن کی ٹھاٹھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اگر میں اسے پہچان نہ لیتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی امیر زادہ ہے۔ اس نے کہا "آپ کی گاڑی نہ ہو تو میں گھر چھوڑ آؤں؟"

میری اپنی گاڑی تھی۔ وہ دونوں ہمارے ساتھ نیچے اترے۔ میں جب ان سے رخصت ہو کر اپنی گاڑی میں اور وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا تو اس کی گاڑی کے مقابلے میں میری گاڑی گھسی پٹی ٹیکسی لگتی تھی۔

"کون ہے؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کون ہے۔" میں نے جواب دیا —— "یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ کون تھا۔"

جس شام وہ مجھے ملا تھا اس سے چھ ساڑھے چھ سال پہلے کا ایک دن مجھے یاد آیا۔ یہ آدمی جسے میں اب نوابوں کے روپ میں دیکھ رہا تھا، چھ سال پہلے میرے دفتر میں آیا اور پوچھا —— "آپ مجھے کوئی نوکری دے سکتے ہیں؟" —— میں نے اسے ذرا غور سے دیکھا اور ڈانٹ کر دفتر سے نکال دینے سے پہلے سوچا کہ یہ آدمی جو درخواست دینے اور میرے سپرنٹنڈنٹ یا ہیڈ کلرک کے پاس جانے کی بجائے سیدھا میرے دفتر میں آ گیا ہے اور چپڑاسی کے روکنے سے بھی نہیں رکا تھا، ان

آدمیوں میں سے نہیں ہے جو دفتروں کے کلرکوں اور چپڑاسیوں سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ اس دفتر میں کوئی جگہ خالی ہے؟ — معلوم نہیں اس آدمی نے جس کی اُس وقت عمر تقریباً پچیس سال تھی، مجھ پر کیا اثر کیا کہ میں نے اسے دھتکار دینا مناسب نہ سمجھا۔ میرے پاس جگہ بھی کوئی خالی نہیں تھی۔ میں نے اسے کہا — "مجھے افسوس ہے کہ یہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔"

"صاحب! میری سفارش کرنے والا کوئی نہیں" اس نے کہا۔ "میرے پاس آپ کے کلرکوں کو دینے کے لیے رشوت کے پیسے بھی نہیں" — میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔ کہنے لگا — "میں اس دفتر کے آدمیوں سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ درخواست دے دو، کوئی سفارش لے آؤ اور ایک کلرک نے اشارے سے بتایا ہے کہ کچھ پیسے بھی لے آؤ.... تو صاحب! مجھے نوکری چاہیے۔ آپ میری سفارش کریں یا مجھے رشوت کے لیے پیسے دیں۔"

مجھے غصہ بھی آیا اور میں اس کی دلیری پر حیران بھی ہوا کہ وہ میرے ماتحت محکمے کو رشوت دینے کے لیے مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ یہ شخص پاگل ہے یا بہت ہی مجبور۔ میں پاکستان کے انہی افسروں میں شامل تھا جنہیں آپ "افسر شاہی" کہا کرتے ہیں۔ لیکن اس جوان آدمی کو میں افسروں کی طرح دھتکار نہیں سکا۔ ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ٹلنے کے لیے نہیں آیا تھا۔

"بہت خجل اور خوار ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں"۔ اُس نے کہا۔

"خدا کے واسطے یقین کرلو کہ میرے پاس کوئی جگہ خالی نہیں ہے"۔ میں نے

جھنجھلا کر کہا۔

"آپ اتنے بڑے افسر ہیں"۔ اس نے کہا۔ "مجھے اپنے گھر میں ہی نوکر رکھ لیں نوکروں کے کوارٹروں میں ایک کمرہ دے دیں۔ صاحب! مجھے صرف نوکری کی ضرورت نہیں حفاظت کی بھی ضرورت ہے۔ مجھ پر صرف یہ مہربانی کریں کہ اپنے بنگلے میں مجھے کوئی وقت دے دیں۔ میں آپ کو ساری بات بتاؤں گا پھر آپ کو مجھ پر ضرور ترس آ جائے گا"

اس نے ٹلنے کا بہانہ مجھے دے دیا۔ میں نے اسے اپنی کوٹھی کا پتہ بتا کر کہا "شام ساڑھے پانچ بجے آ جانا"

"میں ضرور آؤں گا" اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے مجھے دیا ہوا قرض وصول کرنے آئے گا۔ کہنے لگا — "میں ضرور آؤں گا۔ اپنے کتے اور اپنے نوکروں کو بند کر رکھنا۔ کسی نے مجھے روکا تو میں پچھلے سے کھڑکی میں سے اندر آ جاؤں گا۔ پچھلے زینے سے اوپر چڑھ جاؤں گا — میں آپ سے ملوں گا ضرور"۔

برابر شک یقین میں بدل گیا کہ یہ شخص دماغی عارضے میں مبتلا ہے۔ میں نے بہرحال یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے ضرور ملوں گا — شام کے ساڑھے پانچ بجے میں چائے پی کر لان میں ٹہلنے لگا۔ میں اپنے آپ کو ایک پاگل کی گفتگو کے لیے تیار کر رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ میں نے اسے لان ہی میں بلا لیا۔ کرسیاں رکھی تھیں۔ اسے بٹھایا اور اس کے لیے چائے منگوائی۔ اس نے کہا — "صاحب! میری بات بڑی لمبی ہے۔ آپ کے پاس اتنا وقت ہوگا؟"

"تم بات شروع کرو میرے وقت کی پرواہ نہ کرو"۔ میں نے کہا۔

"صاحب! مجھے نوکری کی اتنی ضرورت نہیں جتنی پناہ کی ہے"۔ اس نے کہا۔ "پولیس کی نگاہ میں میں مجرم ہوں لیکن میں جرائم سے بھاگ رہا ہوں اور پولیس میرے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ پولیس مجھے مجرم بنا کر چین لے گی۔ میرا پہلا جرم یہ ہے کہ میں ایک ایسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا جسے چھ سال بعد مر جانا تھا۔ میں باپ کا پہلا بچہ تھا۔ یہ بتا کر بات لمبی نہیں کروں گا کہ مجھے ماں اور باپ کی طرف سے کتنا پیار ملا ہوگا۔ کتنے کھلونے ملے ہوں گے۔ میری ہر ایک بال ہٹ ماں باپ نے کس طرح پوری کی ہو گی۔ میں گھر کا شہزادہ تھا۔ ماں بھی اور باپ بھی میرے اشارے پر ناچتے تھے عمر چھ سال ہوئی۔ میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا.....

"ایک شام میری ماں کو ہسپتال لے گئے۔ اسے دوسرا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ میں نے وہ رات ماں کے بغیر گزاری۔ صبح جاگا تو مجھے پتہ چلا کہ اب مجھے عمر کی ساری راتیں ماں کے بغیر گزارنی ہوں گی۔ ماں کو سویرے سویرے گھر لایا گیا۔ اسے مونجھ کی چارپائی پر ڈال کر اندر لائے تھے۔ میں بہت خوش ہوا کہ امی آگئی ہے۔ مگر وہ زندہ نہیں تھی۔ اسے بچی پیدا ہوئی تھی لیکن کیس بگڑ گیا۔ بچی دنیا میں آتے آتے مر گئی اور ماں بھی مر گئی.....

"میں یہ سنا کر بھی آپ کو بور نہیں کروں گا کہ مجھ پہ کیا گزری۔ باپ سکول بھیجتا تو میں قبرستان میں چلا جاتا تھا اور امی کی قبر پہ بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ پوچھا کرتا تھا، امی کب آؤ گی؟ میرے ہم جماعتوں نے میرے باپ کو بتا دیا کہ میں بہت دنوں سے سکول نہیں جا رہا۔ باپ نے میری جذباتی حالت سمجھے بغیر میری پٹائی کر دی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ باپ نے مجھے مارا تھا۔ میں تو اب اسی سے ماں کا پیار بھی مانگتا تھا۔ دوسرے

دن وہ مجھے خود سکول چھوڑ آیا۔ اس نے پیار کی کوئی بات نہ کی۔ اس طرح مجھے ڈانٹتا اور دھمکیاں دیتا سکول لے گیا جیسے میرا دشمن ہو۔ کلاس میں گیا تو ماسٹر صاحب نے کان پکڑوا دیئے اور اس وقت چھوڑا جب میری ٹانگوں میں طاقت نہ رہی اور میں پہلو کے بل گر پڑا.....

"میرے لیے پیار ختم ہو گیا۔ میں بگڑنے لگا۔ رونا میری عادت ہو گئی۔ باپ کے لیے میرا رونا بلاوجہ تھا لیکن میں اپنی امی کو ڈھونڈتا تھا۔ رات باپ مجھے اپنے ساتھ سلاتا تھا۔ ایک بار میں نے اسے جگایا اور کہا کہ پیاس لگی ہے۔ باپ نے مجھے گالیاں دیں اور دھکیل کر بستر سے اٹھا دیا۔ کہنے لگا، جاؤ، خود پی آؤ پانی۔ مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا۔ باپ نے اٹھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر باورچی خانے میں لے گیا۔ بتی جلائی اور مجھے حکم دیا کہ ڈالو پانی اور پیو..... اس کے بعد کئی بار رات کو میری آنکھ کھلی، پیاس لگی ہوتی تھی مگر میں باپ کو نہیں جگاتا تھا۔ اپنے آپ آنکھ لگ جاتی تھی۔ پھر میری پیاس مر گئی.....

"ایک روز میری ایک پھوپھی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ وہ شادی شدہ تھی۔ اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ میں اس کے بھائی کا بچہ تھا۔ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ میری پرورش کرنے کے لیے مجھے لے گئی تھی۔ اس نے مجھے ماں والا پیار دیا اور میں سنبھل گیا۔ ماں بہت یاد آتی تھی لیکن پھوپھی اور اس کے بچوں نے میرا دل بہلا لیا.....

"مگر صاحب! ہماری چار دیواری کی دنیا افریقہ کے ان جنگلوں سے کم خطرناک نہیں جہاں انسان بھی آدم خور اور درندے بھی آدم خور ہوتے ہیں اور جہاں کے

متعلق بتاتے ہیں کہ سورج تو نکلتا ہے لیکن جنگل تاریک رہتا ہے اور جہاں بتاتے ہیں کہ ایسے درخت بھی ہیں جن کی چھاؤں گھنی اور ٹھنڈی ہوتی ہیں مگر اس کے نیچے کھڑے ہو جاؤ تو درخت کی ٹہنیاں خون چوس لیتی ہیں۔ یہی حال ہمارے گھرانوں میں ہوتا ہے۔ میری پھوپھی کی ساس کو اگر میرا وہاں رہنا پسند نہیں تھا تو صاف کہہ دیتی کہ اس بچے کو ہم یہاں نہیں رکھنا چاہتے۔ اس نے پہلے تو مجھے گھورنا شروع کیا۔ پھر مجھے بلانا چھوڑا۔ پھر میری پھوپھی کو اشاروں اشاروں میں بتانا شروع کیا کہ یہ بچہ ہمیں منظور نہیں....

"اس کے دل کی باتیں میری پھوپھی کو محلے کی عورتوں سے معلوم ہوتی تھیں۔ ہمارے گھروں میں یہی طریقہ رائج ہے۔ ساس اور بہو ایک دوسری کے سامنے شکایتیں کرنے کی بجائے محلے کی عورتوں کو بتاتی ہیں اور یہ عورتیں دو چار باتیں اپنے پاس سے ملا کر ساس کو الگ اور بہو کو الگ بتاتی ہیں۔ پھر یہ ساس اور بہو ان کی شکایتیں ان کی ساسوں اور بہوؤں کو بتاتی ہیں۔ یہی طریقہ میری پھوپھی کے گھر بھی رائج تھا۔ ایک روز میں کمرے میں بیٹھا سکول کا کام کر رہا تھا تو محلے کی ایک عورت آگئی۔ اس نے میری پھوپھی کو بتایا کہ پھوپھی کی ساس اس پر یہ الزام عاید کر رہی ہے کہ اپنے بھائی کے بچے کو بالائی کھلاتی ہے اور باقی دودھ ہمارے بیٹے کے بچوں کو پلاتی ہے۔ پھوپھی نے کہا کہ اس کے بیٹے کے بچے کس کے بچے ہیں؟ کیا وہ میرے بچے نہیں؟....

"میں اس وقت بچہ ہی تھا لیکن صاف پتہ چل رہا تھا کہ میری وجہ سے گھر میں بے رنگی پیدا ہو گئی ہے۔ پھوپھی کے خاوند کا رویہ ٹھیک تھا۔ شاید اسی کے رویے کی بدولت مجھے پھوپھی نے رکھے رکھا۔ ایک روز ساس نے مجھے بلایا۔ میں دوڑا

گیا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں چائے کی ایک پیالی دی۔ اس میں پانی تھا۔ کہنے لگی، یہ پی لو۔ شربت ہے۔ میں نے پی لیا۔ واقعی شربت تھا۔ ساس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور پیار سے کہا کہ جاؤ، کھیلو....

"میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی کہ ساس بھی مجھ سے پیار کرنے لگی ہے میں اتنا خوش تھا کہ اپنی پھوپھی کو بتایا کہ اس کی ساس نے مجھے شربت پلایا ہے۔ پھوپھی کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے شربت کے متعلق مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ رنگ کیسا تھا، ذائقہ کیسا تھا۔ اس کی پریشانی کو دیکھ کر میں ڈر گیا۔ شام کو پھوپھی مجھے ایک شاہ صاحب کے پاس لے گئی اور اسے بتایا کہ میرے بھتیجے کو میری ساس نے شربت میں کوئی تعویذ گھول کر پلا دیا ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ بچے کو کچھ ہو نہ جائے....

"شاہ صاحب نے ایک کتاب نکالی۔ مجھے کہا کہ آنکھیں بند کر کے کہیں انگلی رکھ دو۔ میں نے انگلی رکھی تو شاہ صاحب نے کہا۔ 'خدا نے بچے کو بچا لیا ہے۔ بڑا سخت تعویذ تھا۔ گھبراؤ نہیں۔ جو اللہ کرے گا۔' اس نے دو تعویذ لکھے۔ ایک میرے گلے میں لٹکانے کے لیے اور دوسرا اس نے پانی میں گھول کر مجھے پلا دیا....

"خیر صاحب! یہ تو بڑے لمبے قصے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ گھروں کی کوئی بات کسی گھر سے چھپی نہیں رہتی۔ یہ پتہ چلا کہ پھوپھی کی ساس بھی اسی شاہ صاحب سے تعویذ لائی تھی جو اس نے مجھے پلایا تھا۔ پھر اس شاہ نے اس تعویذ کا توڑ مجھے دیا تھا۔ اس طرح وہ دونوں طرف سے کما رہا تھا۔ ہمارا سارا محلہ اس شاہ کا معتقد اور مرید تھا۔ میری پھوپھی کی ساس کو تعویذوں کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تھی کہ اس کا بیٹا یعنی میری پھوپھی کا خاوند مجھے گھر سے نکالنے پر راضی نہیں ہو

رہا تھا۔ ایک روز ساس نے اپنے بیٹے کو میرے خلاف کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ دس روپے کے ایک نوٹ کی تلاش میں پریشان ہونے لگی۔ کہتی تھی کہ یہیں چارپائی پر رکھا تھا.....

"میری پھوپھی بھی نوٹ ڈھونڈنے لگی۔ اس کی ساس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کسی بچے نے نہ اُٹھا لیا ہو۔ میری پھوپھی کو غصہ آگیا۔ ان دونوں میں ترش کلامی ہوگئی۔ ساس نے ہمارے بستوں کی تلاشی لینی شروع کر دی اور میری ایک کاپی میں سے دس روپے کا نوٹ برآمد کر لیا۔ یہ نوٹ اس نے خود میری کاپی میں رکھا ہوگا۔ گھر میں اس نے اودھم بپا کر دیا۔ مجھے چور اور چور کا بچہ کہا اور میں چوری کے الزام سے ڈر کر رونے لگا۔ اتنے میں پھوپھی کا خاوند آگیا۔ پھوپھی نے اسے بتایا کہ میرے بھتیجے پر تمہاری ماں نے چوری کا الزام لگایا ہے۔ اس کی ماں نے کہا کہ نوٹ اس لڑکے کی کاپی سے نکلا ہے۔ پھوپھی کے خاوند نے میری پھوپھی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا —— "خدا کے لیے اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے اسے لائی ہو، ورنہ کل تم پر بھی چوری کا الزام لگے گا"... میری پھوپھی نے میرا سامان اکٹھا کیا، برقعہ پہنا اور مجھے ساتھ لیے میرے باپ کے حوالے کر آئی...

"مجھ سے پیار پھر چھن گیا اور اس کی جگہ میرے دل پر خوف سا بیٹھ گیا اور میرا چھوٹا سا ذہن سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ مجھے ساس گھر سے کیوں نکالنا چاہتی تھی؟ مجھے تعویذ کیوں پلایا تھا؟ گھر میں باپ کو دیکھا۔ مجھے دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ باپ مجھ سے تنگ آچکا تھا۔ چھ ماہ بعد اس نے اس وجہ سے دوسری شادی کر لی کہ سوتیلی ماں میری پرورش کرے گی...

"سوتیلی ماں جب گھر میں آئی میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے مجھ سے میرا باپ بھی چھین لیا۔ وہ مجھے اپنے پاس سلایا کرتا تھا اب مجھے الگ کمرے میں ڈال دیا گیا۔ رات کو آنکھ کھُل جاتی تھی تو مجھے ڈر لگتا تھا۔ باپ دوسرے کمرے میں بند ہوتا تھا۔ میں ڈر سے کانپتا رہتا اور آنکھ لگ جاتی....

"دو سال گزر گئے۔ میری سوتیلی ماں کا پہلا بچہ پیدا ہُوا۔ میری عمر دس سال ہوگئی تھی۔ اس عمر میں بچے گھر میں جھاڑو دے سکتے ہیں۔ برتن دھو سکتے ہیں۔ دودھ پیتے بچوں کو اٹھا کر باہر لے جا سکتے ہیں تاکہ ماں باپ کے آرام میں مخل نہ ہوں اور وہ نوکروں کی طرح ہر کام کر سکتے ہیں۔ یہ سارے کام مجھے دے دیئے گئے۔ میرے دل پر اور میرے ہونٹوں پر مُہر لگ گئی جیسے میں کچھ محسوس ہی نہیں کر سکتا، نہ کچھ بول سکتا ہوں۔ باپ مجھ سے بیگانہ ہوگیا۔ میں گھر میں نوکروں کی طرح سارے کام کرتا اور رات کو سکول کا کام کرتا۔ گھر میں میرے لیے صرف حکم اور ڈانٹ ڈپٹ تھی۔ میں نے اس اذیت سے اس طرح نجات حاصل کی کہ اپنی امّی کو زبردستی ذہن سے نکال دیا اور اپنے آپ کو بے حس کرنا شروع کر دیا....

"پھر گھر میں ایک اور بچہ پیدا ہُوا اور جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک بچی پیدا ہوئی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میٹرک ضرور پاس کر دوں گا مگر میں اب تین بچوں کا نوکر تھا۔ گھر میں کام زیادہ ہوگیا تھا۔ بچے مجھے بڑا بھائی نہیں، نوکر سمجھتے تھے۔ مجھے گالیاں دیتے تھے۔ جی میں آئے تو شغل کے طور پر مجھے پیٹ بھی لیتے تھے۔ مجھے اجازت نہیں تھی کہ انہیں روکوں یا کچھ کہوں۔ میری گرمیوں کی چھٹیاں اس طرح گزرتی تھیں کہ دوپہر کے وقت سوتیلی ماں اندر سوتی تھی اور

میں چھوٹی بچی کو اٹھائے گلیوں میں بہلاتا رہتا تھا کہ ماں کو تنگ نہ کرے۔

"میں نے میٹرک پاس کر لیا۔ اگر میری ماں زندہ ہوتی تو خوشیاں مناتی، لڈو بانٹتی۔ مگر گھر میں کسی کو جیسے خبر ہی نہ ہوئی ہو۔ باپ نے مجھے کہیں نوکر کرانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کہا کہ میں آگے پڑھوں گا۔ باپ نے پہلے تو مجھے غصّے سے گھورا پھر کہا — 'نواب کے بچے، میں کہہ رہا ہوں کہیں نوکری کر' — اچانک میری وہ ساری حسّیں جاگ اٹھیں جنہیں میں نے مار دیا تھا۔ سارے زخم کھل گئے۔ آنسو خشک ہو گئے اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ بڑی مشکل سے اپنے غصّے پر قابو پایا اور باپ سے کہا — 'نوکری تو میں کر ہی رہا ہوں۔ اگر میں نہ ہوتا تو آپ کو گھر میں ایک نوکر اور ایک خانساماں رکھنا پڑتا۔ میں دونوں کے کام کر رہا ہوں۔ اس کے عوض آپ مجھے روٹی، کپڑا دے رہے ہیں۔ آپ نے میری تعلیم پر جو خرچ کیا ہے اِسے میں اپنی تنخواہ سمجھتا ہوں...'

"باپ نے غصّے سے کہا — 'یہ تُو اپنے باپ سے بات کر رہا ہے؟' — جی نہیں۔ اپنے آقا سے، میں نے ایک عرصہ ہُوا آپ کو باپ سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔' باپ غصّے سے پھٹنے لگا۔ اُدھر سے اس کی بیگم دوڑی آئی باپ نے اسے بتایا کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ پھر باپ نے یہ حکم سنایا کہ وہ مجھے گھر سے نکال دے گا۔ میری سوتیلی ماں بڑی چالاک تھی۔ اس نے میری ہمدردی میں کہا کہ نہ نہ، اپنا بچہ ہے، گھر سے کیوں نکالیں گے۔ اس نے دراصل سوچ لیا تھا کہ میں گھر سے نکل گیا تو وہ نوکر اور خانسامے سے محروم ہو جائے گی...

"میں نے گھر میں جھاڑو برتن کا کام چھوڑ دیا۔ سوتیلی ماں نے ایک روز مجھے کہہ

دیا — 'میں تجھ جیسے مسٹنڈے کو مفت کی روٹیاں نہیں کھلاؤں گی' — میں نے نہایت تحمل سے اسے کہا — 'میں یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ اپنی ماں کے تمام زیورات لے کے جاؤں گا اور اپنی ماں کے وہ تمام ریشمی کپڑے جو تُو نے اپنی ماں اور بہنوں کو لے جا کر پہنائے ہیں ان کی قیمت بھی لے کر جاؤں گا....

"شام کو باپ گھر آیا تو اس نے اسے بتایا اور مکّار عورتوں کی طرح رو رو کر بتایا۔ باپ مجھے مارنے کو دوڑا تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ میں نے اسے کہا — 'مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ تجھے بیٹھے کے بل گرا کر تیرے سینے پر بیٹھ جاؤں میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ تُو میرا باپ نہیں ہے۔ اگر محلے برادری میں عزّت چاہتے ہو تو آئندہ مجھ پہ ہاتھ نہ اٹھانا' — باپ نے شاید اپنی بوڑھی کلائی پر میرے جوان ہاتھ کے شکنجے کی مضبوطی محسوس کر لی تھی۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور وہ سر جھکا کر کمرے میں چلا گیا....

"اسی شام باپ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ اکیلا تھا۔ میں اسے دشمن سمجھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا — 'تم بھول گئے ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں؟ — میں تمہارا باپ ہوں بیٹے!' اس کے لہجے میں شکست تھی۔ غصّے کا نام و نشان نہ تھا۔ میرے دل کا پتھر یکلخت موم ہو گیا۔ میری ہچکی نکلی اور میں بے قابو ہو کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں بے اختیار اس کے پاؤں میں بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں پکڑ کر روتا ہی رہا....

"اس نے مجھے اُٹھا کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا۔ وہ اُٹھا اور اپنے کوٹ میں

سے دس دس روپوں کے چند ایک نوٹ نکال لایا۔ میری طرف بڑھا کر کہنے لگا —— "یہ لو اور آگے پڑھو۔۔۔۔ اور مجھے اپنا باپ سمجھو"۔ اس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا —— "تمہیں ہو کیا گیا تھا؟" —— میں نے سر اُٹھا کر اسے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور میری فریادیں نکل گئیں۔ میرے منہ سے یہی الفاظ نکلے۔ "ابّا جان، امّی کی یاد نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ مجھے اس کی قبر پہ جھونپڑی بنا دو۔ وہیں جا کے رہوں گا"۔۔۔۔

"اچانک سوتیلی ماں آگئی۔ نوٹ ابھی میرے باپ کے ہاتھ میں تھے۔ سوتیلی ماں نے بھوکی چیل کی طرح جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے نوٹ چھین لیے اور سخت بیہودہ لہجے میں بولی —— "لاڈ کر کر کے اسے پہلے تھوڑا بگاڑا ہوا ہے کہ اب نوٹوں کی گٹھی اس کے ہاتھ میں دے رہے ہو؟ گھر میں اور کوئی بچہ نہیں ہے؟" —— باپ بے چارا اس کے ہاتھ میں بے بس تھا۔ چُپ چاپ کھڑا سُن رہا تھا۔ میں نے غصّے سے باؤلا ہو کر اس مکروہ عورت کی کلائی پکڑ لی اور اتنی زور سے مروڑا دیا کہ بل کھا کر اس کے گھٹنے فرش سے لگ گئے اور اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لے کر باپ کو دے دیئے اور کہا —— "میں آگے نہیں پڑھوں گا ورنہ یہ عورت آپ کا جینا حرام کر دے گی"، سوتیلی ماں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ میرے باپ نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ اس کمبخت عورت نے وہ چیخ و پکار کی کہ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ چار دیواری کی قیدی عورتوں کے لیے یہ تماشے بہت ہی دلچسپ ہوتے ہیں۔ گھروں کی گھٹن کو وہ ایسے ہی تماشوں سے کم کیا کرتی ہیں۔۔۔۔

"محلے میں باتوں کے بتنگڑ بن گئے۔ باپ کو میں نے دیکھا جیسے بے چارا مر

ہی گیا ہو۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کے دل میں میری محبت زندہ ہے مگر بیوی کے سامنے مجبور اور بے بس ہے۔ اس نے مجھے ایک بار پھر کہا کہ تم کالج میں داخل ہو جاؤ، میں خرچ دیتا رہوں گا۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود سوتیلی ماں نے گھر میں چین اور سکون ختم کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ میری وجہ سے ہے۔ اگر میں اس گھر سے نکل جاؤں تو اس عورت کو چین آجائے۔ لیکن میں جاتا کہاں؟۔۔۔۔

"ایک روز میری ماں کے گاؤں کا ایک آدمی مل گیا۔ مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا۔ دو تین دفعہ میرے باپ سے ملنے بھی آیا تھا۔ اسے شہر میں نوکری مل گئی تھی۔ اسے ایک دوست نے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہاں دو آدمی پہلے ہی رہتے تھے۔ ان چاروں کا کھانے کا مسئلہ تھا۔ ہوٹل کا کھانا مہنگا تھا اور اچھا بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ہانڈی روٹی کر لیتا ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں۔ مجھے صرف روٹی کپڑا دے دیا کریں اور تنخواہ اتنی دے دیں جس سے میری کالج کی فیس اور کتابوں کی قیمت نکل آئے۔ انہوں نے مجھے رکھ لیا۔ میں نے باپ سے کہا کہ گھر میں میری موجودگی اس کے لیے اذیت کا باعث بنی ہوتی ہے اس لیے میں جاتا ہوں۔ اُس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور مجھے رخصت کر دیا۔۔۔۔

"میں ان چار آدمیوں کا باورچی بن گیا۔ میرے کھانے سے وہ مطمئن تھے۔۔۔۔ میں نے فسٹ ایئر کی کتابیں خرید لیں اور ان کی مدد سے پرائیویٹ تیاری شروع کر دی۔ ابھی ایک سال پورا نہیں ہوا تھا کہ محلے کا ایک آدمی ملا۔ اس نے بتایا کہ میرا باپ بیمار ہے۔ میں اس گھر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ باپ کو دیکھنے چلا گیا۔ وہ تو آخری منزل تک پہنچ چکا تھا یا بیوی نے پہنچا دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر رو پڑا اور اس نے میرا ہاتھ

پکڑ لیا۔ وہ شاید میرے ہی انتظار میں تھا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا کہ اس نے ہچکی لی اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ بیوی کے جہنّم سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگیا۔

"میرا دماغ نابالغ تھا اور جو مجھ پر گزر رہی تھی اس کے اثر سے میں ذرا سی بات پر غصّے سے باؤلا ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنے گھر کی دیواروں کو دیکھا۔ چھتوں اور کواڑوں کو دیکھا تو مجھے بچپن کے وہ دن یاد آگئے جب یہاں میری امّی اور میرے ابّا زندہ تھے تو یہ مکان میرے لیے شیش محل تھا۔ پھر اس پر اس ڈائن نے اپنا سایہ ڈالا اور آج وہ اس کی مالک بن گئی ہے۔ بارود کے شعلے کی طرح میرے اندر یہ ارادہ چمکا کہ یہ مکان میرا ہے اور میری سوتیلی ماں نے میری ماں کے جس زیور پر قبضہ کر رکھا ہے وہ بھی میرا ہے اور میں اپنی ملکیت سے دستبردار نہیں ہونگا۔۔۔۔

"میں نے اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا۔ گھر آکر میں نے سوتیلی ماں سے کہا کہ میری ماں کے زیورات مجھے دے دو اور اس مکان سے نکل جاؤ۔ اُس نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے اس طرح شور مچا دیا جیسے میں اسے مار رہا ہوں۔ اس کے دو بھائی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ پر رُعب جھاڑنے کی کوشش کی۔ میں غنڈہ تو نہیں تھا لیکن غنڈوں کی طرح انہیں دھمکی دی کہ میں اب تو ٹل جاؤں گا لیکن اپنا حق چھوڑوں گا نہیں۔۔۔۔

"دوسرے دن پھر جا دھمکا۔ سوتیلی ماں عورتوں میں بیٹھی تھی۔ اسے باہر بلا کر کہا کہ زیورات دے دو۔ اس کے بھائی ابھی وہیں تھے۔ وہ غنڈہ گردی پر اُتر آئے۔ میں غنڈہ بن گیا۔ مارا بھی اور مار کھائی بھی۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔۔۔۔

"میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ میں سوتیلی ماں کے بھائیوں کے جانے کا انتظار

کرتا رہا۔ رات کو میں اس محلے میں جا کر اپنے کسی ہمجولی سے پوچھ آتا کہ اب میرے گھر میں کون کون ہے۔ ایک رات پتہ چلا کہ سب چلے گئے ہیں اور سوتیلی ماں اکیلی رہ گئی ہے۔ میں اس گھر سے بچپن سے واقف تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ لوگ رات کو اندر سوتے تھے۔ میں نے اپنے جگری دوست کو راضی کر لیا تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر سے کوٹھے پر چڑھ جانے دے۔ وہ میرا ہمدرد اور غم خوار تھا۔۔۔۔

"آدھی رات سے ذرا پہلے جیسا کہ میں نے اس سے طے کیا تھا، میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ یہ کمرہ گلی کے ساتھ تھا۔ میرے دوست کے گھر کے تمام افراد اندر سوئے ہوئے تھے۔ سیڑھیاں اس کمرے کے ساتھ تھیں۔ میں نے دوست سے کہا کہ سو جاؤ، زندگی ہوئی تو ملیں گے۔ میں اس کی چھت پر گیا۔ فصیل پھلانگ کر اگلے کوٹھے پر گیا۔ وہاں سے دبے پاؤں اگلی فصیل پھلانگی۔ یہ میرے مکان کی چھت تھی۔ وہاں سے سیڑھیوں کے راستے نیچے اُترا۔ یہ میری ماں کا گھر تھا جہاں میں چوروں کی طرح گیا۔۔۔۔

"سوتیلی ماں کے کمرے کے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ کھُل گیا۔ میں نے سوئچ دبایا۔ کمرہ روشن ہوگیا۔ سوتیلی ماں اور اس کے بچّے سوئے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ روشنی سے سوتیلی ماں کی آنکھ کھُل گئی۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ چیخ مارنے لگی کہ میں نے اسے چاقو دکھا کر کہا ——— "آواز مُنہ سے نکالو گی تو ختم کر دوں گا۔ خاموشی سے مجھے میری ماں کے تمام زیورات دے دو ——— وہ اُٹھی اور ٹرنک میں سے صرف دو چیزیں نکال کر میری طرف پھینکیں اور بولی۔ "بس یہی کچھ تھا اس کا" ——— میں نے کہا ——— "ایک ہار تھا۔ چار چوڑیاں تھیں

تین انگوٹھیاں تھیں.... ہر ایک چیز فوراً نکال دو۔ — اس نے مجھے ساری چیزیں نکال دیں۔ یہ میری ماں کے زیورات تھے....

"میں صحن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس گھر پہنچا جہاں میں نوکر تھا۔ باہر میں تالا لگا گیا تھا۔ چاروں آدمی اندر سوئے ہوئے تھے۔ میں نے تالا کھولا اور باورچی خانے میں جا کر سو گیا۔ صبح اُٹھا تو میں نے چاروں کو زیورات دکھا کر انہیں ساری بات بتا دی۔ ان کی نیت خراب ہو گئی۔ پہلے تو مجھے پولیس سے ڈرایا اور مشورہ دیا کہ زیورات انہیں دے دوں۔ ایک نے کہا کہ وہ زیور اپنے گاؤں چھوڑ آئے گا تاکہ پولیس یہاں آئے تو مال یہاں سے برآمد نہ ہو....

"میں نے ان کی کوئی بھی بات نہ مانی تو انہوں نے کہا کہ وہ پولیس کو رپورٹ کر دیں گے کہ یہ چوری کا مال ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ انسان اندر سے کتنا کھوکھلا ہوتا ہے۔ تھوڑا سا سونا دیکھا اور دشمن بن گیا.... وہ تین دن مجھ سے زیورات ہتھیانے کے جتن کرتے رہے۔ رات کو میں نے انہیں کھانا کھلایا اور جب سو گئے تو میں نے زیورات کی پوٹلی سنبھالی اور اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گیا....

"میں باہر تو نکل گیا لیکن میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہمدرد دوست وہ ایک ہی تھا جس نے مجھے اپنی سیڑھیوں سے چڑھایا تھا۔ میں اس کے گھر کو چل دیا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو گئی۔ میں ایک گلی کا موڑ مڑا تو آگے سے پولیس کے دو سپاہی گشت پر آ رہے تھے۔ گلی میں بتی کی روشنی تھی۔ میں ان سے ڈرا نہیں۔ ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے روک لیا اور پوچھا کہ کہاں رہتے ہو اور کہاں جا رہے ہو۔ ایک سپاہی نے میرے ہاتھ سے پوٹلی لے لی اور کھول لی۔ اس نے حیران

ہو کر کہا — 'یہ تو سونے کا زیور ہے۔ چوری کا ہے'....

"کھلی ہوئی پوٹلی اس کی ہتھیلی پر رکھی تھی۔ میں نے جھپٹا مارا اور زیورات اس سے چھین کر دوڑ پڑا۔ وہ میرے پیچھے دوڑے۔ انہوں نے شور مچا دیا۔ آگے سے دو آدمی آ رہے تھے۔ سپاہیوں نے 'چور ہے، پکڑلو' کا شور مچا رکھا تھا۔ وہ آدمی بھی میرے پیچھے دوڑے۔ میں ایک اور گلی میں چلا گیا....

"میرا تعاقب جاری رہا اور میں شہر کے ایک دُور کے محلے میں پہنچا اور ایک تنگ گلی میں چلا گیا۔ دوڑ دوڑ کر مجھے چکر آنے لگے۔ میں ایک دروازے میں بیٹھ گیا۔ یہ باہر کا دروازہ تھا۔ مکان کی دو تین منزلیں تھیں۔ دروازے کے اندر اندھیرا تھا۔ باہر کی ہلکی ہلکی روشنی سے مجھے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں بہت ہی ڈرا ہوا تھا۔ ٹانگیں درد کر رہی تھیں۔ میں اس ارادے سے اُٹھا کہ سیڑھیاں چڑھ جاتا ہوں۔ یہاں جو کوئی رہتا ہے اسے کہوں گا کہ یہ زیورات لے لو اور مجھے پناہ دو۔ میں خوفزدہ تھا اور ہار گیا تھا۔ اُوپر گیا تو ایک کمرے میں روشنی تھی۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ میں نے دستک دی اور ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا اور کہا — 'یہاں صرف گانا بجانا ہوتا ہے۔ آگے چلے جاؤ'۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے اندر آنے دیں اور میری بات سن لیں....

"مختصر بات یہ ہے کہ میں طوائفوں کے بازار میں چلا گیا تھا۔ اور جب گھر میں میں داخل ہوا، وہاں صرف ناچ گانا ہوتا تھا۔ اس آدمی نے میری ساری بات سنی۔ اس کے پاس چھ جوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے زیورات اس آدمی کو دے دیئے۔ میری ساری بپتا سن کر اس نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں کہاں کا شریف

آدمی تھا۔ مجھے پناہ اور اچھے سلوک کی ضرورت تھی۔ دونوں چیزیں مل گئیں....

"وہاں ان لڑکیوں کو ناچنا اور گانا سکھایا جا رہا تھا۔ میں جب ان میں گھل مل گیا تو اس گھر کے راز فاش ہونے لگے۔ ان چھ لڑکیوں میں تین ایسی تھیں جو مہاجرین کے قافلوں کے ساتھ ہندوستان سے آئیں اور ریفیوجی کیمپوں سے ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ بیچاری مجبور تھیں۔ میری طرح انہیں بھی پناہ اور پیار ملا تو یہی پیشہ اختیار کر لیا۔ ان میں ایک لڑکی میرے زیادہ قریب ہو گئی۔ وہ لدھیانہ سے آئی تھی۔ اس کے گھر کے لوگ بھاگ گئے تھے اور اسے کسی گاؤں کے لوگ راستے میں ملے اور اپنے ساتھ یہاں لے آئے تھے....

"اس لڑکی نے بھی میری آپ بیتی سنی تھی۔ اس نے مجھے وہاں سے بھاگنے پر اُکسانا شروع کر دیا۔ میں خود یہی چاہتا تھا۔ وہاں مجھے تین مہینے ہو گئے تھے اور ان لڑکیوں کے آقا مجھ پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ ایک روز ہمیں وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں شہر کے ایک ایسے محلے میں چلا گیا تھا جو ہندوؤں اور سکھوں کا تھا۔ اب وہاں مہاجرین آباد ہو گئے تھے۔ میرے ساتھ جو لڑکی تھی وہ مہاجر تھی۔ مجھے مہاجروں کے ہاں ہی پناہ مل سکتی تھی۔ میں لڑکی کو ایک مسجد میں لے گیا اور مولوی صاحب کو اپنی ساری کہانی سنا دی۔ انہوں نے محلے کے دو معزز آدمی بلا لیے۔ انہوں نے مجھے پناہ بھی دے دی اور ایک نے مجھے اپنا منشی بنا لیا۔ وہ آڑھتی تھا۔ ایک کمرے کا مکان بھی مل گیا....

"یہاں سے تعاقب اور فرار کی ایک اور کہانی شروع ہو گئی۔ پہلے تو نامعلوم لوگوں نے میرے خلاف یہ بات اڑائی کہ میں اس لڑکی سے عصمت فروشی کراتا ہوں۔ مہاجروں

نے میرا ساتھ دیا۔ ایک رات پولیس نے آ چھاپہ مارا۔ محلے کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے ہمارے چال چلن کی گواہی دی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ زیورات کی چوری میں نہ پکڑا جاؤں لیکن بعد میں اپنے محلے کے دو دوستوں سے میں نے پتہ کرایا تھا کہ سوتیلی ماں نے پولیس کو رپورٹ نہیں کی۔ زیورات تو اب میرے پاس تھے ہی نہیں وہ اس گھر میں چھوڑ آیا تھا جہاں سے لڑکی کو لایا تھا۔ میں بہت پریشان تھا....

"کچھ دن گزرے تو شام کے وقت دو آدمی آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ 'کسی نے بتایا ہے کہ یہاں مال ہے۔ کہو کیا لیتے ہو۔ جو قیمت ہم دیں گے وہ اور کسی سے نہیں ملے گی'۔ ان سے جان چھڑائی تو یہ سلسلہ اور تیز ہو گیا۔ ہر شام دو آدمی آ جاتے اور یہی بات کہتے۔ میں جس آڑھتی کے پاس منشی تھا اسے بھی پُراسرار طریقوں سے پریشان کیا جانے لگا۔ پولیس کے دو کانسٹیبل بھی اس سازش میں شریک تھے....

"میں نے ایک روز وہ مکان چھوڑ دیا اور وہاں سے دُور ایک مکان میں چلا گیا۔ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ وہاں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سب لوگ مقامی تھے۔ وہاں پندرہ بیس روز تو سکون سے گزر گئے۔ پھر وہاں بھی میرے متعلق مشہور ہو گیا کہ میرے ساتھ طوائف ہے اور میں عصمت فروش ہوں۔ محلے کے تین بزرگوں نے مجھے بلایا اور مجھے خبردار کیا کہ یہ شریفوں کا محلہ ہے، یہاں سے نکل جاؤ اور بازار میں جا بیٹھو۔ میں نے انہیں ماں کے مرنے سے اب تک کی کہانی سنا دی مگر کسی نے یقین نہ کیا۔ بلکہ ایک نے کہا۔ 'ان لوگوں پر خدا کی لعنت برسے۔

اب جس طوائف کے پاس جاؤ وہ کہتی ہے کہ مہاجر ہوں۔ مجھے یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ جناب یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو طوائفوں کے پاس جانے کا عادی ہو.... میں نے انہیں یقین دلانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا....

"ایک روز ایک اجنبی میرے گھر آیا اور کہا۔ "مال واپس کردو ورنہ کہیں بھی چین سے نہیں رہ سکو گے۔ ایک دن تم خود لڑکی کو لے کر ہمارے پاس آجاؤ گے۔ بہتر ہے کہ عزت سے لڑکی کو وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے تھے"۔... میں کس سے انصاف مانگتا؟ پولیس کے دو کانسٹیبل بھی ان کے ساتھ تھے۔ میں ڈر کے مارے تھانے نہیں جاتا تھا کہ خود ہی نہ پھنس جاؤں....

"محلہ مجھے عصمت فروش کہہ رہا تھا۔ ایک روز میں اس محلے سے بھی نکل گیا اور شہر کے ایک اور کونے میں جا بسا۔ دو روز بعد آڑھتی نے مجھے نوکری سے جواب دے دیا۔ اسے اس قدر پریشان کیا گیا تھا کہ بے چارے نے کاروبار کی خاطر مجبور ہو کر مجھے جواب دے دیا۔ اس نے مجھے کہا کہ مجسٹریٹ کے پاس لڑکی کو لے جاؤ اور اسے اپنی کہانی سناؤ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی نہ عدالتوں کے راستوں سے کوئی واقفیت تھی۔ میرے پاس اتنے ہی پیسے تھے کہ چند دن دال روٹی چل سکتی تھی۔

"میں نے سرکاری دفتروں کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ مجھے امید یہ تھی کہ سرکاری نوکری مل گئی تو افسروں کو اپنی بپتا سنا کر اپنی عزت کی حفاظت کا انتظام ہو جائے گا.... صاحب! پورا ایک سال پولیس کے دو کانسٹیبلوں نے اور بردہ فروشوں نے مجھے پریشان کیے رکھا۔ ہماری اس سوسائٹی نے جنہیں شریفوں کی سوسائٹی کہتے ہیں، میرا ساتھ نہیں دیا بلکہ بدمعاشوں کے آگے سر جھکائے رکھا....

"چھ مہینوں سے سرکاری نوکری ڈھونڈ رہا ہوں۔ ان چھ مہینوں میں مزدوری بھی کی ہے۔ اب ایک ہوٹل میں بیراگیری کر رہا ہوں۔ پرسوں ہوٹل میں دو بھلے آدمی آئے۔ ان کے آگے چائے رکھی اور پوچھا کہ کہیں سرکاری نوکری دلا دیں۔ انہوں نے مجھ میں دلچسپی لی اور آپ کا نام بتایا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ کسی طرح سیدھا آپ سے جا ملو۔ انہوں نے آپ کی شرافت کی بہت تعریف کی تھی۔ میں آپ کے کلرکوں سے ملا تو ایک کلرک نے میرے کان میں کہا ـــــ "سفارش لاؤ یا پیسے۔ نوکری مل جائے گی"ـــ آج میں یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ خواہ آپ کو پولیس بلانی پڑے میں آپ کے دفتر میں گھس جاؤں گا"۔

یہ نوجوان اپنی کہانی مختلف لوگوں کو ایک سو بار سنا چکا تھا۔ معلوم نہیں لوگ کیوں متاثر نہیں ہوئے۔ میں نے اسے اپنے دفتر میں نوکری دلا دی اور اپنے سرونٹ کوارٹروں میں بھی اسے جگہ دے دی۔ وہ لڑکی کو وہیں لے آیا۔ میں نے ایک مجسٹریٹ سے کہہ کر لڑکی کا بیان ریکارڈ کروا لیا اور دونوں کی شادی کرا دی۔ پھر انہیں کسی نے پریشان نہیں کیا۔ چھ مہینے بعد مجھے وہاں سے تبدیل کر دیا گیا۔ دارالخلافہ اسلام آباد منتقل ہو گیا تھا۔ میری جگہ جو افسر آیا، میں اس آدمی اور اس کی بیوی کو اس کے حوالے کر آیا۔ میں اسلام آباد چلا گیا۔ چھ سال بعد میں پھر اسی شہر میں آگیا اور ایک شام یہی آدمی مجھے نوابوں کے روپ میں ملا۔ وہ چپ چاپ سی لڑکی کسی ریاست کی مہارانی لگتی تھی۔ میں اس سے زیادہ باتیں نہ کر سکا۔ مجھے وہ اپنی گاڑی تک لے گیا۔ میں نے پوچھا "کیا کرتے ہو؟" اس نے کہا ـــ "عیاشی!"

"میں یہاں زیادہ دیر رک نہیں سکتا"۔ اس نے کہا۔ "میں ساری عمر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ بات یوں ہوئی تھی کہ آپ مجھے جس افسر کے حوالے کر گئے تھے، اس نے

میری بیوی پر جال پھینکنے شروع کر دیئے۔ اسے مری لے جانے کی کوشش کی جب اسے ٹکا سا جواب ملا تو ہمیں سرونٹ کوارٹر سے نکال دیا اور مجھے پریشان کرنے لگا۔ پھر مجھ پر ایک جھوٹا الزام لگا کر نوکری سے نکلوا دیا۔ اپنے اس محکمے کو آپ جانتے ہیں کہ تعلق کیسے لوگوں سے ہوتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ یہ سوسائٹی مجھے شریفوں کی زندگی نہیں بسر کرنے دے گی۔ میں نے ان لوگوں سے تعلق جوڑ لیا۔ مجھ میں مجرم بننے کے سارے وصف موجود تھے مگر میں انہیں دبا رہا تھا۔ 'شریف' لوگوں نے مجھ میں انتقام کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ میں نے اپنا راستہ بنا لیا۔ اب عیش کرتا ہوں۔ ریوالور ہمیشہ پاس رکھتا ہوں۔ مگر آپ کا غلام ہوں۔ کوئی حکم دیں۔ کوئی خدمت بتائیں۔"

"تم میری کیا خدمت کرو گے؟" میں نے ازراہِ مذاق پوچھا۔

"انڈیا سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دیں۔" اس نے میرے مذاق کا جواب سنجیدگی سے دیا۔ "سعودی عرب سے سونا منگوانا ہو۔ کسی ملک سے کوئی چیز منگوانی ہو۔ خدا کی قسم حاضر کر دوں گا۔ اب یہ سرحدیں اور یہ سمندر میرا راستہ نہیں روک سکتے۔"

آج مجھے ریٹائر ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ وہ مجھے پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ یاد بہت آتا ہے اور سوچتا ہوں کہ اس کہانی کے اتنے زیادہ کرداروں میں اصل مجرم کون ہے۔

میں گناہ گار تھی مگر شہزادی تھی

یہ گناہوں کی سزا ہے جو میں اطمینان اور سکون سے بھگت رہی ہوں۔ یہ داستان ختم نہیں ہوتی۔ ذرا جا کر دیکھو کہ مجھ جیسی لڑکیاں کس طرح ہیپی بنتی جا رہی ہیں۔ میں نے راز کی ساری باتیں سنا دی ہیں۔ یہ راز قوم کے آگے رکھ دیا

راوی : گمنام

تحریر : شمیم اور فردوس

لوگ کہتے تھے، یہ عصمت فروشی کا اڈہ ہے۔

ہم نے بھی وہی سچ مان لیا تھا جو لوگ کہتے تھے۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ کسی کے خلاف کوئی بُری بات دس پردوں میں بیٹھ کر کرو تو فوراً مشہور ہو جاتی ہے اور لوگ اسے صرف سچ ہی نہیں مان لیتے، اپنے پاس سے مرچ مصالحہ لگا کر اسے اور زیادہ لذیذ اور قابلِ قبول بنا دیتے ہیں۔

ہم نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں اور ہندوستانی ریاستوں کے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے اندر کے حالات کے متعلق دو کتابیں پڑھی تھیں۔ ایک کا نام "محلات کے راز" اور دوسری کا "محلاتی سازشیں" تھا۔ ان میں کئی ایک دلچسپ راز بے نقاب کیے گئے تھے لیکن ہم نے جب اپنی چار دیواری کی دنیا کو غور سے دیکھا تو ہمیں معلوم ہوا کہ بادشاہوں اور نوابوں کے محلات کے راز اور سازشیں ہمارے محلوں کی اندرونی باتوں کے مقابلے میں نہ دلچسپ ہیں نہ سنسنی خیز۔ وہ تو بادشاہوں کا معاملہ تھا۔ جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ محلوں میں متوسط اور غریب لوگ رہتے

ہیں، وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔ اسی محرومی یا مجبوری سے ہماری چار دیواری کی دنیا ایسی سنسنی خیز کہانیوں کو جنم دیتی ہے جو کسی کتاب کا عنوان نہیں بن سکیں، کیونکہ اس دنیا کی دیواریں کوئی راز کی بات، باہر نہیں آنے دیتیں۔

وہ گھر ہمارے محلے سے خاصا دُور ایک اور محلے میں تھا۔ وہاں ہماری دو سہیلیاں رہتی تھیں۔ پہلے پہل انہوں نے انگلیاں دانتوں میں دے کر ہمیں سنایا تھا کہ ان کے محلے میں ایک جوڑا کرائے کے مکان میں آیا ہے۔ وہ نوجوان ہیں۔ ان کا ابھی کوئی بچہ نہیں اور نہ ہوگا۔ لڑکی اچھی خاصی خوبصورت ہے اور آدمی بھی شکل و صورت کا اچھا ہے۔ وہ دونوں محلے میں کسی سے بات نہیں کرتے۔ اڑوس پڑوس میں کسی سے میل ملاقات نہیں۔ صبح پہلے یہ آدمی باہر نکل جاتا ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد لڑکی نکل جاتی ہے۔ شام کے وقت اکٹھے آتے ہیں۔ تیسرے چوتھے روز رات کو باہر چلے جاتے ہیں اور بہت دیر سے آتے ہیں۔ محلے کے لوگ کہتے ہیں یہ دونوں عصمت فروش ہیں اس لیے کوئی عورت ان کے گھر نہیں جاتی۔

یہ کوئی نئی یا عجیب خبر نہیں تھی۔ ہمارے معاشرے میں کون سی برائی نہیں؟ کون سا محلہ پاک رہ گیا ہے؟ ہماری ان دو سہیلیوں نے اس جوڑے کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں سنائیں۔ ہم دونوں بھی ان سہیلیوں سے ملنے جایا کرتی تھیں۔ ہم نے اس لڑکی کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھا۔ ایک روز اس کے خاوند کو بھی دیکھا۔ ہم اتنی تجربہ کار تو نہیں کہ صورت دیکھ کر بتا دیں کہ یہ عورت شریف ہے یا بدمعاش۔ بدمعاشوں کی کوئی خاص نشانی تو ہوتی نہیں۔ البتہ ہمارے ذہن میں عصمت فروش عورت کا ایک گھناؤنا اور مکروہ سا تصور تھا۔

اس لڑکی کو ہم نے اس تصور سے مختلف دیکھا۔ اس کے چہرے میں جہاں کشش تھی وہاں اداسی کا سایہ بھی صاف نظر آتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ طوائفیں بڑا ہی شوخ میک اپ کیے رکھتی ہیں۔ بال خاص ڈھنگ سے بناتی ہیں اور چال ڈھال شریف عورتوں سے بہت ہی مختلف ہوتی ہے۔ ہم نے اس لڑکی میں ایسی کوئی نشانی نہ دیکھی لیکن ہم نے اسے شریف لڑکی نہیں سمجھا کیونکہ محلے میں لوگ وثوق سے کہتے تھے کہ وہ شریف نہیں۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھی ہماری دلچسپی کی چیز تھی۔ ہم دونوں نے اسے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم نے اس کے روزمرّہ کا معمول معلوم کر لیا تھا۔ ایک روز ہم دونوں اس کے گھر میں داخل ہو گئیں۔ ہم "حکایت" کا شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء ساتھ لے گئی تھیں۔ یہ ایک کمرے کا خستہ سا مکان تھا جس میں چھوٹا سا ایک باورچی خانہ، ذرا سا بیت الخلاء اور تین چار گز چوڑا صحن تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں دو منزلہ مکان تھے اور اس کے اوپر بھی ایک مکان تھا اور جس ڈیوڑھی میں سے گزر کر اس مکان میں داخل ہوتے تھے اس پر بھی ایک مکان تھا جس کی دو منزلیں دور اوپر تک چلی گئی تھیں۔

جب ہم اس مکان میں داخل ہوئیں تو دل یوں گھبرا گئے جیسے ہمیں قبر میں اتار دیا گیا ہو۔ کمرہ اندھیرا غار تھا جس میں دن کے وقت بھی بلب جل رہا تھا۔ دیواریں گیلی تھیں، گرد اور کھونٹیوں کی بھرمار، مکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ کمرے میں مونجھ کی دو چارپائیاں رکھی تھیں جن پر غریبانہ سے بستر بچھے ہوئے تھے۔ صرف ایک کرسی تھی اور دیوار کے ساتھ ایک ٹرنک اور اس پر ایک اٹیچی کیس رکھا تھا۔ دیوار میں گاڑی ہوئی کیلوں

کے ساتھ ان دونوں کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

یہ مکان اور اس کی ہر ایک چیز بتا رہی تھی کہ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو دن بھر محنت اور مزدوری کر کے بھی پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اس قسم کے گھٹیا اور غاروں کی طرح کے مکانوں میں مزدور اور کم آمدنی والے لوگ رہا کرتے ہیں۔ اردگرد اور اوپر رہنے والے لوگ اسی کلاس کے تھے۔ ایک ایک مکان دو دو تین تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ڈیوڑھیاں مشترک تھیں۔

ہم جب اس کے گھر میں داخل ہوئیں تو السلام علیکم کہی۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے ہمارے سلام کا جواب نہ دیا اور ایسی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگی جن میں حیرت تھی۔ جیسے ہم غلطی سے اس کے گھر میں داخل ہو گئی ہوں۔ وہ دروازے میں ہی کھڑی رہی اور ہم صحن کی دو گز چوڑائی عبور کر کے اس کے قریب جا کھڑی ہوئیں — تب اس نے کہا — "کیسے؟"

"آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

"مجھ سے؟"

"جی آپ سے۔"

"آئیے۔"

ہم کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اس نے کرسی سرکائی۔ ہم چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہم نے کمرے کا جائزہ لیا پھر اسے دیکھا۔ وہ کسی مزدور یا چپڑاسی کی بیوی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے چہرے کو ہم گورا نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال پرکشش رنگ ہے اور لڑکی بلاشبہ خوبصورت ہے۔ ہمیں پہلا خیال یہ آیا کہ یہ ویسی ہوتی

جیسی مشہور ہے تو اس کے گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ اس کی شکل و صورت، قد بت اور عمر ایسی تھی کہ اپنی جتنی بھی قیمت مانگتی، کوئی پیسے والا اسے دے دیتا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی ہمیں دیکھ رہی تھی اور ضرور حیران ہو رہی تھی کہ ہم اس کے گھر کیوں آئی ہیں۔

ہم اُلوؤں کی طرح کبھی کمرے کو دیکھ لیتیں اور کبھی اسے دیکھ لیتیں۔

"آپ میرے پاس کیوں آئی ہیں؟" اُس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

ہم چونکیں اور ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ اگر اس کے متعلق ہمارے ذہن صاف ہوتے تو ہم یوں چُپ نہ بیٹھی رہتیں۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات کیسے شروع کریں اور کیا بات کریں۔ آخر ہم نے پہلا سوال کیا۔ "آپ کے ساتھ آپ کے خاوند ہیں؟"

"جی نہیں۔" اس نے جل کر کہا ——— "یہ میرے دلال ہیں۔ یہی پوچھنے آئی ہو نا ہیں طوائف ہوں۔ رنڈی ہوں۔ میں اس کنوئیں میں آ چھپی تھی کہ یہاں مجھے کوئی نہیں دیکھ سکے گا مگر تم لوگوں کی نظریں ایسی پھٹی ہوئی ہیں کہ تمہیں اپنی کرتوت نظر نہیں آتی اور گناہگار دوسروں کو کہتے ہو۔"

اس کے غصے اور احتجاج نے ہمارے دماغ کھول دیئے اور ہماری جھجک بھی دُور کر دی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم اس محلے کی نہیں، بڑی دُور کے محلے کی رہنے والی ہیں۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہماری دو سہیلیاں یہاں رہتی ہیں جن سے ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ لوگوں نے اسے بلاوجہ بدنام کر رکھا ہے۔ ہم جاسوسی یا تفتیش کرنے نہیں آئیں۔ پھر ہم نے اپنا تعارف کرایا اور "حکایت" کا وہ صفحہ کھول کر اس کے آگے رکھ دیا جس میں "استانی اور ٹیکسی ڈرائیور" کے

عنوان سے حمیدہ بانو کی سُنائی ہوئی اور ہماری قلمبند کی ہوئی آپ بیتی چھپی تھی۔

اس نے کہانی پڑھنی شروع کر دی۔ ہم اسے دیکھتی رہیں۔ وہ شاید بھول گئی تھی کہ ہم اس کے پاس بیٹھی ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اس کے آنسو نکل آئے۔

اُس نے کہانی پڑھ کر جب ہماری طرف دیکھا تو اس کے چہرے سے غصہ ڈھل چکا تھا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان جو باتیں ہوئیں ان میں درد اور خلوص تھا جو جلد ہی بے تکلفی میں بدل گیا۔ وہ ہماری نیت کو پہچان چکی تھی۔ اس نے کہا۔ "میرے خلاف یہ الزام غلط ہے کہ میں طوائف ہوں لیکن میں یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتی کہ میں پاک صاف ہوں۔ میں گناہوں سے بھاگ کر اس اندھیری کوٹھڑی میں آکر چھُپی ہوں۔"

اسے اپنے کام کے لیے باہر جانا تھا۔ اس نے ہمیں دوسرے دن بلایا۔ ہم دوسرے دن اس کے ہاں گئیں۔ اس نے چائے کا تردد کر رکھا تھا اور اپنی داستان سنانے کے موڈ میں تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے جو قصہ سنایا وہ ہم مختصر کر کے اسی کے الفاظ میں پیش کرتی ہیں:

"میں اِن خاندانوں میں سے ایک کی لڑکی ہوں جو امیر نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو غریب بھی نہیں کہلانا چاہتے۔ مڈل کلاس کی یہی خرابی ہوتی ہے کہ اس کے لوگ اپنی غربت چھُپانے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے ڈھینگیں مارتے رہتے ہیں۔ مثلاً پلنگ کے لیے ایک نئی چادر خریدیں گے تو سارے محلے کو دکھاتے پھریں گے۔ عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ درمیانہ درجہ کے گھرانوں میں عزت اور آبرو کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ لڑکی کو عزت

نشان سمجھا جاتا ہے.....

"وہ وقت یاد آتا ہے تو میرا دل لہو کے آنسو روتا ہے جب، میں ان پابندیوں اور پردے سے نفرت کیا کرتی تھی۔ میں نے اسے پسماندگی اور جہالت کہا تھا۔ آج اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ میری عمر اُس وقت تیرہ سال تھی جب مجھے پردے میں بٹھا لیا گیا تھا پھر میں بُرقعے میں سکول جاتی تھی۔ مجھے برقعہ اچھا لگتا تھا۔ گھر کا ماحول قصبے کے عین مطابق تھا۔ میرے والد کی آمدنی تھوڑی اور اولاد بہت تھی۔ اس پہ کم عقلی یہ کہ تنخواہ تو نہیں بڑھتی تھی، اولاد بڑھتی جا رہی تھی۔ مکان اپنا تھا۔۔

"پھر مہنگائی بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی رشوت بھی عام ہونے لگی۔ اخراجات بڑھ گئے۔ اولاد بڑھ گئی۔ میرے والدین کے لیے گھر چلانا مشکل ہو گیا۔ اس کا اثر ان کی طبیعت پر پڑا۔ آٹھ بچے گھر میں طوفان کھڑا کیے رکھتے تھے۔ ہم آپس میں لڑنے لگے۔ گالی گلوچ کرتے تھے۔ پھر ہماری پٹائی ہوتی تھی۔ میرے والد طبیعت کے بڑے اچھے ہوا کرتے تھے مگر وہ ہر وقت، غصے میں رہنے لگے۔ دفتر سے آتے اور الگ بیٹھ جاتے۔ کبھی وہ ہماری ماں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور کبھی ماں ان پر برس پڑتی۔ اس طرح گھر میں کوئی سکون نہ رہا.....

"میری حالت یہ تھی کہ جتنی دیر سکول میں رہتی، خوش رہتی۔ گھر سے وحشت ہوتی تھی۔ میرے بڑے بھائی نے ایف۔ اے پاس کر لیا تو اسے میرے والد کی کوششوں سے ایسے محکمے میں نوکری مل گئی جہاں رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ میرے بھائی کی ماہوار تنخواہ دو سو روپے تھی لیکن بعض اوقات وہ دو سو روپے ایک دن میں گھر لے آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ رشوت لینے کا ماہر تھا اور افسروں کو بھی خوب

حصہ دیا کرتا تھا۔ اسی لیے اس کے دفتر کے بڑے عہدوں کے آدمی ہمارے گھر آتے رہتے تھے....

"ایک سال میں ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ تمام بچوں کو اچھے کپڑے ملنے لگے۔ گھر میں صوفہ سیٹ آ گیا۔ بہت سی اور نئی چیزیں آئیں۔ ایک سال گزرا تو میرے دوسرے بھائی نے میٹرک پاس کر لیا۔ بڑے بھائی نے اسے بھی اپنے محکمے میں نوکر کرا دیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تو ہمارے گھر میں کوٹھی بنانے کی باتیں ہونے لگیں۔ میں اُس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ مجھے برقعہ پہنا دیا گیا تھا۔ آٹھویں جماعت میں گئی تو بھائیوں نے بُرقعہ اُتروا دیا اور مجھے اس گھٹیا سے سکول سے ہٹا کر ایک انگریزی سکول میں داخل کرا دیا۔ دوسرے بچوں کو بھی انگریزی سکولوں میں داخل کرایا گیا اور ہم امیر ہو گئے۔ امیر تو وہ بھی ہوتے ہیں جو عادات اور اخلاق سے غریب لگتے ہیں۔ وہ حلال کی کمائی کو چھپا چھپا کر رکھتے ہیں مگر ہمیں خدا نے چھت پھاڑ کر دولت دی تھی....

"میرے بھائیوں کے دماغ خراب ہو گئے۔ وہ تو جوان تھے، میری ماں بھی پٹڑی سے اُتر گئی۔ اس نے دلہنوں کی طرح زیورات پہننے شروع کر دیئے اور گھروں میں جا جا کر نمائش کرنے لگی۔ میری دو بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں۔ میری منگنی دس گیارہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ والدین نے امیری کے نشے میں منگنی منسوخ کر دی...

"بھائی ایڈوانس ہو گئے۔ شلوار قمیض پہننے والے بڑے ہی قیمتی سوٹ پہننے لگے۔ اگر یہ دولت حلال کی ہوتی تو میرے ماں باپ سوچ سمجھ کر خرچ کرتے۔ پرانا مکان بیچ کر کوٹھی بنا لیتے مگر پیسے جس طرح پانی کی طرح آتے تھے اسی طرح

شو بازی اور دعوتوں میں اُڑ جاتے تھے۔ بھائیوں نے گھر کے ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنایا اور اسے خوب سجایا۔ اس میں دوستوں کی دعوتیں ہوتی تھیں دوست نوجوان تھے۔ یہ سب، ان گھروں کے لڑکے تھے جہاں ٹھیکیداریوں کی یا رشوت کی دولت آتی تھی۔ ان کی حرکتیں نازیبا ہوتی تھیں۔ چیخ چیخ کر قہقہے لگاتے تھے۔ سگریٹ پیتے تھے اور شاید باہر سے شراب پی کر بھی آتے تھے۔ ہمارے گھر میں شراب ابھی نہیں آئی تھی۔ میرے بھائی ان اوباش امیرزادوں کے رنگ میں رنگے گئے۔۔۔۔

"میں نے میٹرک پاس کر لیا تو مجھے کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ مقصد محض شو بازی تھا۔ گھر میں آنے والے دوستوں کے ساتھ بھائیوں نے میرا تعارف بھی کرا دیا۔ اس کی ضرورت انہیں یہ پیش آئی تھی کہ بھائی مجھے سوشل بنانا چاہتے تھے۔ کالج میں مجھے تعلیم سے تو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، میں صرف فیشن کے طور پر کالج جاتی تھی۔ اس لیے وہاں میرا دوستانہ شو باز لڑکیوں سے ہو گیا۔ وہ امیروں کی لڑکیاں تھیں نئے فیشن کے ماڈل بن کر کالج میں آتی تھیں۔ میں نئے فیشن کے کپڑے تو پہن لیتی تھی، باتیں کرتے آدھے لفظ انگریزی کے بولتی تھی لیکن میرا ذہن اس پرانے محلے کی گلیوں سے ابھی باہر نہیں نکلا تھا۔ گھر کی چار دیواری کی قید کا اثر جو بچپن سے ذہن میں سمایا ہوا تھا، ابھی تک، پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔۔۔۔

"باپ کی غربت کے دوران گھر میں جو بے مزگی پیدا ہو گئی تھی اس کا اثر بھی تھا۔ میں کچھ گھٹی گھٹی رہتی تھی۔ ہنستی تو میں ضرور تھی مگر یوں پتہ چلتا تھا جیسے کسی چیز نے میرا گلا دبا لیا ہے۔ میں سمجھ نہیں سکتی تھی کہ مجھ میں کون سی کمی ہے۔ حالانکہ لڑکیوں سے

مجھے کئی بار کہا تھا ——"تم بڑی سویٹ ہو"—— انہوں نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میں خوبصورت ہوں۔ پھر بھی میرے سینے میں زنگ سا جما ہوا تھا۔۔۔

"ایک روز لڑکیاں مجھے صبح گیارہ بجے کے شو میں انگریزی پکچر دکھانے لے گئیں۔ یہ انگریزی کی پہلی پکچر تھی جو میں دیکھ رہی تھی۔ اس میں ایسے ایسے ننگے سین تھے کہ میرا جسم کانپ کانپ جاتا تھا۔ مجھ میں ابھی شرم موجود تھی۔ پکچر ختم ہوئی تو میری سہیلیوں نے پکچر پر تبصرہ کر کے میری شرم دور کر دی۔ اس رات میرے ذہن میں بڑے گندے گندے خیال آتے اور خواب میں میں پکچر کے ہیرو کے ساتھ ہیروئن بنی رہی۔۔۔۔

"ایک روز ایک لڑکی نے مجھے دو تصویریں دکھائیں اور ایک جھلک دکھا کر چھپا لیں۔ یہ ایک، مادر زاد ننگے مرد اور ننگی عورت کی تصویریں تھیں۔ میں انہیں دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور دل میں دیکھنے کی بے قراری بھی تھی۔ میں نے اس سے تصویریں چھین کر دیکھیں۔ اس کے بعد ہم آپس میں ننگی باتیں کرنے لگیں۔ ایک روز ایک سہیلی نے مجھے اردو کا ایک ناول دیا اور کہا کہ پرس میں چھپا لو۔ رات کو پڑھنا۔ میں نے ناول چھپا لیا اور رات کو کھولا۔ یہ اردو کا ناول تھا۔ مرد عورت کو ننگا کر کے پیش کیا گیا تھا۔ وہی الفاظ استعمال کیے ہوئے تھے جو مرد گلیوں میں بکتے پھرتے ہیں۔ کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں تھی۔۔۔۔

"وہ میرے لیے بڑی ہی پُر لطف، اور اس کے ساتھ ہی بڑی ہی مصیبت کی رات تھی۔ تم دونوں شریف لڑکیاں معلوم ہوتی ہو۔ اس لیے میں عُریاں الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتی۔ یہ سمجھ لو کہ میں یہ محسوس کرتی تھی کہ رضائی پرے پھینک دوں اور سارے کپڑے اتار کر باہر سردی میں نکل جاؤں۔ میں نے چھوٹا سا یہ ناول رات

کو بھی سارا پڑھ کر صبح سہیلی کو واپس کیا اور ایسے ہی ایک اور ناول کا مطالبہ کیا۔ اس کے الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں ۔۔ اس نے کہا ـــ "یہ کوہ نور کا ہیرا تو نہیں جو مل ہی نہیں سکتا۔ یہ تصویریں اور یہ ناول تھوڑے سے پیسوں سے مل سکتے ہیں" ـــ ان لڑکیوں نے مجھے بک سٹال اور چھوٹی سی ایک لائبریری دکھا دی جہاں سے مجھے ننگی تصویریں اور ننگے ناول ملنے لگے۔۔۔

" یہ لائبریریاں تم دونوں نے دیکھی ہوں گی۔ محلوں میں بھی موجود ہیں جن میں سامنے بچوں اور بڑوں کے لیے بڑے اچھے اچھے ناول رکھے ہوتے ہیں۔ یہ کرائے پر پڑھنے کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ ان میں جرم اور جاسوسی اور مار دھاڑ کے ناول بھی ہوتے ہیں اور انہی معصوم اور بے ضرر سی لائبریریوں میں یہ ننگے ناول اور بہت ہی ننگی تصویریں بھی مل جاتی ہیں جو وہاں چھپا کر رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ کچے ذہن کے لڑکے اور لڑکیاں یہ تصویریں اور ناول چوری چھپے حاصل کرتے اور دیکھتے ہیں۔ ان کے اثر سے ان بچوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ میرے حشر سے تم پر واضح ہو جائے گا۔ میں تمہیں اپنی کہانی تمہاری خواہش پر نہیں سنا رہی۔ میرا دل اُبل رہا تھا کہ اپنے ملک کے بزرگوں اور لیڈروں کو اپنا آپ دکھاؤں اور انہیں کہوں کہ مجھے دیکھو اور قوم کے بچوں کو تباہی سے بچاؤ۔۔۔

"میرا ذہن چار دیواری کا گھٹا ہوا تھا۔ محنت کے بغیر حاصل کی ہوئی دولت نے دیواریں توڑ دی تھیں۔ میں نے اخلاق کی زنجیریں بھی توڑ دیں۔ اسی کو میں ہائی سٹینڈرڈ سمجھتی تھی۔ باقی سب پسماندگی تھی۔ میرے بھائیوں نے مجھ میں جب بے حیائی کی جھلک دیکھی تو وہ خوش ہوئے کہ میں سوشل اور ایڈوانس ہو گئی ہوں لیکن جسے میں

آج بے حیائی کہہ رہی ہوں اسے میں اُس وقت بے حیائی نہیں سمجھتی تھی میرا دماغ اس زمین پر نہیں تھا۔ عُریاں فلمیں دیکھنا عادت بن گئی، ننگے ناول اور تصویریں نشے کی صورت اختیار کر گئیں اور میں ایک پیاس محسوس کرنے لگی جو مجھے راتوں کو سونے بھی نہیں دیتی تھی۔۔۔۔

"میری امیر کبیر سہیلیوں کے پاس اس کا علاج بھی موجود تھا۔ یہ علاج تم دونوں نے بھی دیکھا ہو گا۔ لڑکیوں کے کالجوں کے باہر چھٹی کے وقت کاریں اور سکوٹر کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں بہت کم کاریں اور سکوٹر ان لڑکیوں کے اپنے ہوتے ہیں جو اُن پر بیٹھتی ہیں۔ یہ ان کے دوست ہوتے ہیں جنہیں ہم بوائے فرینڈ کہا کرتی تھیں۔ میری سہیلیوں کے بھی دوست تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ میرا تعارف کرایا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں بھی کوئی دوست ڈھونڈ لوں۔۔۔۔

"اتفاق سے اپنی سہیلیوں میں میری شکل وصورت اچھی تھی۔ ایک روز میری ایک سہیلی کے دوست نے مجھے راستے میں روک لیا۔ اس نے انہی الفاظ میں باتیں کیں جو میں انگریزی اور اردو فلموں میں سنا کرتی تھی اور ناولوں میں بھی پڑھا کرتی تھی۔ یہ الفاظ مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان الفاظ نے بہت گھر اجاڑے ہیں۔۔۔

"میں اسی بے حیائی کی دلدادہ تھی۔ میں نے اس کی دوستی فوراً قبول کر لی۔ میرا کردار اور اخلاق تو کوئی تھا ہی نہیں۔ ریت کی ڈھیری تھی۔ دو روز بعد میں اس کے ساتھ ایک ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے نہایت پُرتکلف لنچ کھلایا۔ دن بھر کے لیے اس نے کمرہ لے لیا تھا۔ ہم نے کچھ باتیں انگریزی میں کیں، کچھ پنجابی میں کیں اور کچھ باتیں انگریزی اور پنجابی میں کیں۔ انگریزی کی ننگی فلمیں، ننگے ناول، رسالے

اور ننگی تصویریں میری عقل اور میری عزت پر قابض تھیں......

"اس دُبلے پتلے نوجوان نے مجھ پر ایسا نشہ طاری کر دیا کہ میرا ذہن اور میرا دل پیار دلداری کی قید سے آزاد ہو گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں پلنگ پر ان تصویروں کی طرح ننگی پڑی تھی جنہوں نے مجھے اس کمرے تک پہنچایا تھا۔ ایک جھجک تھی جو دُور ہو گئی تھی۔ دیوار گر پڑی تھی۔ خوف ختم ہو چکا تھا۔ البتہ تاسف سا محسوس ہوا جو اس کی باتوں سے دُور ہو گیا۔ میں پوری طرح سوشل اور ایڈوانس ہو گئی.....

"یہ نوجوان میرا دوست بن گیا۔ مجھ سے پہلے وہ میری جس سہیلی کا دوست تھا وہ ایک روز مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ ہماری بہت لڑائی ہوئی۔ میں نے اس لڑکے کو بتایا تو اس نے مجھے بتایا کہ تمہاری یہ سہیلی دوستیاں کرنے کی عادی ہے.... پھر مجھے پتہ چلا کہ میری سہیلیوں کا یہ گروہ پوری طرح بدکاری میں ڈوبا ہوا ہے۔ اب میں بھی کھل کر میدان میں آگئی اور اپنے بوائے فرینڈ کی باتیں سہیلیوں کو سنانے لگی۔ اس کے بعد میں جس زندگی میں داخل ہو گئی اسے میں بہت ہی ہائی سٹینڈرڈ کی زندگی سمجھتی تھی۔ ان لوگوں کو میں گھٹیا اور پسماندہ کہا کرتی تھی جو عزت اور اخلاق کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میرا گھر ابھی اسی محلے میں تھا جہاں کے رہنے والوں نے ہمیں بدنام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارا سب کے ساتھ سوشل بائیکاٹ ہو چکا تھا لیکن ہمیں کسی کی پرواہ نہیں تھی.....

"وقت بہت تیزی سے گزرتا گیا۔ مجھے جو راستہ سہیلیوں نے دکھایا تھا، میں نے کالج میں نئی نئی آنے والی لڑکیوں کو دکھایا۔ کالج کے تیسرے سال میں میں تجربہ کار

ہو چکی تھی۔ خدا نے شکل اچھی دے دی تھی اور گھر میں پیسہ بھی تھا۔ مگر اب مجھے گھر کے پیسے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی خوبصورتی اور جوانی کو چار چاند لگانے کے لیے ایکٹنگ اور زبان کے جادو میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ میں اتنی تجربہ کار ہو گئی تھی کہ ایک لیکچرار کے دوست کو بھی پھانس لیا تھا...

"اس زندگی اور اس دنیا کو میں جنت سمجھتی تھی۔ انگریزی کی ننگی فلمیں، جنسی ناول اور ننگی تصویریں تو میرے لیے اتنی ضروری ہو گئی تھیں جتنی روٹی جسم کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہ ایک نشہ تھا جس کی لگائی ہوئی آگ بجھانے کے لیے مجھے گناہوں کی آخری حد تک پہنچنا پڑتا تھا۔ بس ایک نشہ تھا جس میں میری عمر گزرتی جا رہی تھی۔ میں بی۔ اے کے آخری سال میں فیل ہوئی تو مجھے بہت خوشی ہوئی...

"شہر میں انگریزی طرز کے ہوٹل کھل گئے تھے۔ دیسی طرز کے جو شریفانہ ہوٹل تھے ان میں سے بھی بعض نے یورپین ہوٹلوں کے طور طریقے اختیار کر لیے۔ ان کے تہ خانوں میں پاکستان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے انگریزی ڈانس سیکھنے شروع کر دیئے۔ پھر وہ ہپی بن گئے۔ چرس اور شراب چلنے لگی۔ میں کئی بار ان تہ خانوں میں گئی۔ مگر یہ تہ خانے مجھے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا کرتے تھے۔ ہم لڑکے اور لڑکیاں پاگلوں کی طرح ناچتے اور حیوانوں کی طرح ایک دوسرے سے دل بہلاتے تھے۔ وہاں لڑکوں میں لڑائیاں بھی ہوتی تھیں۔ پاکستان کے شہر امریکہ کے شکاگو بن چکے تھے...

"تم دونوں یہ نہ سمجھنا کہ میرے بھاگ آنے سے وہاں کوئی تبدیلی آگئی ہے۔ وہاں اب بھی ہماری پوری نسل چرس، شراب، ہپی ناچ، ہلڑ بازی اور بدکاری میں تباہ

ہو رہی ہے۔ اگر تم وہاں جا کر ان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھو تو کہو گی، نہیں، یہ پاکستانی نہیں ہیں۔ یہ سمندر پار کی کوئی جنگلی نسل ہے جو اتنے قیمتی کپڑے پہن کر ہمارے ملک کے ہوٹلوں میں غلاظت پھیلانے آگئی ہے۔ ان کے جنگلیوں کی طرح بڑھے ہوئے بال اور ہونٹوں تک گئی ہوئی قلمیں اور ان کے دبلے پتلے جسم دیکھ کر تم انہیں اپنے ملک کے باشندے نہیں کہو گی۔ لیکن اُس وقت مجھے یہ اچھے لگتے تھے۔ بے سُرے انگریزی میوزک پر ان کی دھما چوکڑی جسے ہم ڈانس کہا کرتے تھے، مجھے بڑی پیاری لگتی تھی۔۔۔

"کالج تو ایک رسم بن کے رہ گئی۔ رقابت میں لڑکے لڑتے تھے تو مجھے لطف آتا تھا۔ کوئی ایک سال گزرا، ایک ولایتی ہوٹل میں پاکستانی ہپیوں کا اجتماع تھا۔ یہ سب امیر زادے تھے اور ان کے ساتھ چند ایسے نوجوان بھی تھے جو متوسط طبقے کے تھے۔ وہ ایسے ہوٹلوں کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یا تو گھروں سے پیسے چُرا لیتے تھے یا امیر زادوں کو چرب زبانی سے پھانس کر ان کے پیسے پر عیش کرتے تھے۔ اُس رات ہم نے بہت ہنگامہ کیا۔۔۔۔

"کچھ دنوں سے ایک نوجوان آدمی میری دوستی کا دم بھرنے لگا تھا۔ مجھے وہ اچھا لگتا لیکن میں اس سے اکتانے لگی کیونکہ وہ سچی محبت کی باتیں کرتا تھا اور جذباتی ہو جاتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے کہا — "اُس ولایتی دھمال میں وہ لطف نہیں جو اصل محبت میں ہے۔ آؤ باہر چلیں" — میں نے جھنجھلا کر کہا — "او، شٹ اپ یُو پاکستانی ہیرو" — وہ اُداس ہو گیا۔ ایسی حرکتیں ہم لوگ پسماندگی سمجھا کرتے تھے۔ وہ جب بھی مجھے ملتا، جذباتی ہو کر محبت کا اظہار کرتا۔ وہ ہر لحاظ سے ہپی تھا لیکن میرے

ساتھ اس کا سلوک لیلیٰ مجنوں والا ہوتا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ آدمی مجھے صرف اپنی محبت میں گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ میں اس سے کترانے لگی۔۔۔۔

"مجھے ایک نئے امیر زادے نے لپیٹ میں لے لیا اور میرے ہاتھ میں ایک سو روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ ہر لحاظ سے یورپین ہپی لگتا تھا۔ اس نے مجھے باہر چلنے کو کہا اور بتایا کہ اس کی گاڑی ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوٹل سے باہر آئی اور اس کی کار میں بیٹھ گئی۔ کار ابھی سٹارٹ نہیں ہوئی تھی کہ اس جیسے تین اور نوجوان دوڑتے آئے اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ یہ سب نشے میں تھے اور انگریزی گانے گا رہے تھے۔ میں سٹپٹائی کیونکہ میں اس اکیلے کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن کار سٹارٹ ہوئی اور ہوٹل کے گیٹ سے نکل کر ہوا ہو گئی۔۔۔۔

"ان چاروں نے کار میں اودھم مچا رکھا تھا۔ پچھلی سیٹ والوں نے مجھے پریشان کر دیا کہ کبھی ایک پیچھے سے میرا سر ہاتھوں میں دبا کر میرا منہ پیچھے کر کے میرے اُوپر آ جاتا اور کبھی دوسرا۔ وہ چھوڑتے تو کار والا بایاں بازو میری گردن کے گرد ڈال کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیتا۔ میں تنگ آگئی لیکن غصے کا اظہار پسماندگی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر قہقہے لگا رہے تھے۔۔۔۔

"گاڑی شہر سے نکل کر ویرانے میں چلی گئی اور رُک گئی۔ ایک نے انگریزی میں کہا۔ "آؤ فرض کر لیں، ہم چار اعلیٰ نسل کے کُتے ہیں اور یہ ہم سب سے اعلیٰ نسل کی کُتیا ہے" — سب نے بے ہنگم قہقہہ لگا کر داد دی۔ گاڑی کے پچھلے دروازے کھلے۔ میں اکیلی تھی اور وہ چار تھے۔ بلاشک و شبہ اُس وقت اُن کی ذہنی حالت کُتوں والی تھی۔ میں ڈر گئی۔ مجھے جو یہ کہہ کر لایا تھا کہ آؤ باہر چلیں، اسے میں نے

کہا کہ تم اکیلے آنا چاہتے تھے، یہ کیا بدتمیزی ہے؟ اُس نے غنڈوں کی طرح مجھے گاڑی سے باہر کو گھسیٹ کر کہا۔ "اگر ہمت ہے تو ہمارے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کرو"......

"اُس وقت مجھے معلوم نہیں کہ غیرت کی وہ کونسی رتّی تھی جو میرے اندر رہ گئی تھی۔ اس آدمی نے اپنے آپ کو کُتّے اور مجھے کُتیا کہہ کر غلط نہیں کہا تھا۔ کم از کم میں کُتیا ہی تھی لیکن اس آدمی نے چیلنج کیا تو میرے سینے میں بھونچال آگیا۔ میں نے اسے کہا۔ "اگر تم میں ہمت ہے تو میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کرو"۔۔۔ یہ صرف دھمکی تھی جو ایک لڑکی نے چار جوان آدمیوں کو دی تھی اور لڑکی بھی ایسی جسے وہ جانتے تھے کہ شریف نہیں اور صحیح معنوں میں کُتیا ہے۔ بہرحال میں خالی ہاتھ ہی مرنے مارنے پر تُل گئی۔ چاروں نے امریکی فلموں والے کاؤ بوائز کی طرح ایکٹنگ کی اور قہقہہ لگایا......

"سڑک پر ایک موٹر سائیکل یا سکوٹر کی روشنی دکھائی دی۔ ہم سڑک سے بیس پچیس گز دُور تھے۔ اُن میں سے کسی نے بھی پرواہ نہ کی کہ کوئی آرہا ہے۔ ایک نے میرا بازو پکڑا تو میں جھٹکے سے بازو چھڑا کر سڑک کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ چاروں میرے پیچھے آئے اور مجھے پکڑ لیا۔ اتنے میں سکوٹر ہمارے قریب آگیا۔ ہماری طرف مُڑا اور ہمارے درمیان آن رُکا۔ ایک آدمی نے اسے دھمکی دے کر بھاگ جانے کو کہا۔ میں نے اسے کہا۔ "یہ مجھے زبردستی گاڑی میں ڈال کر لے آئے ہیں"...

"اُس نے سکوٹر کھڑا کیا۔ سٹارٹ ہی رہنے دیا اور لائٹ بھی آن رہنے دی جس سے وہاں روشنی ہو گئی۔ سکوٹر والے نے اپنے سامنے والے کے منہ پر سیدھا

گھونسہ مارا تو وہ چھ سات قدم پیچھے جا پڑا۔ فوراً ہی اس نے دوسرے کی ناف میں لات ماری تو وہ دُہرا ہو کر زمین پر تڑپنے لگا۔ اتنے میں دوسرے دو اُس پر ٹوٹ پڑے۔ ایک نے پیچھے سے اس کی گردن بازوؤں کے گھیرے میں لے لی اور دوسرے نے اس کے پہلو میں گھونسہ مارا۔ سکوٹر کی روشنی میں مجھے ایک پتھر نظر آگیا۔ میں نے وہ اُٹھا کر اس کے سر پر مارا جس نے اس آدمی کو پیچھے سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ تیورا کر پرے جا پڑا۔ ایک رہ گیا تھا۔ اسے اس آدمی نے صرف دو گھونسوں میں گرا دیا۔ دو گاڑی کی طرف بھاگے اور گاڑی سٹارٹ کر کے بھاگ گئے.....

"اُس وقت میں نے سکوٹر کی روشنی میں دیکھا کہ یہ وہ نوجوان تھا جو مجھے سچّی محبت کے سبق دیا کرتا تھا۔ وہ جسم سے اتنا طاقتور نظر نہیں آتا تھا مگر اُس نے چاروں کو مار کر بھگا دیا تھا۔ دو تو کار میں بھاگ گئے اور دو نہایت برخورداری سے ایک طرف چل پڑے۔ وہ دُبلے پتلے، مریل مریل سے نوجوان تھے۔ نشے اور آوارگی نے ان کی مردانگی چُوس لی تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو کُتّے کہا تھا لیکن بلیّوں کی طرح بھاگ گئے۔ اب اس جوان مرد کے سامنے میں اکیلی رہ گئی۔

وہ کولہوں پر ہاتھ رکھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا سانس پھُول گیا تھا۔ وہ ایک دو منٹ مجھے دیکھتا رہا اور اچانک اُس نے اس قدر زور سے میرے منہ پر تھپّڑ مارا کہ میری آنکھوں کے سامنے ستارے گھومنے لگے۔ میں گرنے لگی تو اُس نے مجھے بازو سے پکڑا اور جھٹکا دے کر سیدھا کر لیا۔ بڑے غصّے سے بولا۔ "کچھ ہوش آئی؟"....

"میں کچھ بھی نہ بولی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر سکوٹر تک لے گیا۔ کہنے لگا ۔۔۔ "بیٹھو" ۔۔۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور وہ سکوٹر چلا کر دوسری

طرف سے مجھے شہر میں لے آیا۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ اس نے ایک جگہ سکوٹر روک لیا۔ مجھے اترنے کو کہا۔ سکوٹر کھڑا کر کے اس نے کہا۔ ”میں بھی اسی سوسائٹی کا آدمی ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ اخلاق کسے کہتے ہیں مگر تمہیں پہلے روز ہی دیکھا تو تمہاری حرکتوں اور باتوں سے میں سمجھ گیا کہ تمہاری اصلیت کچھ اور ہے لیکن تم کچھ اور بننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں تم سے زیادہ بدکار ہوں۔ میں بھی دوسروں کی طرح تمہارے ساتھ اس قسم کی دوستی کر سکتا تھا جس کی تم عادی ہو لیکن تمہیں دیکھ کر معلوم نہیں میں کیوں شریف آدمی بن گیا۔ تم نے مجھے جاہل سمجھا۔ میں ان چاروں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب یہ کار والا تمہیں باہر لے جا رہا تھا اُس وقت میری نظر اس پر تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو اشارہ کیا تھا جو میں نے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ تمہیں گاڑی میں بٹھا کر ہوٹل سے نکلے تو میں سکوٹر پر پیچھے گیا لیکن کار بہت تیز تھی۔ پھر بھی میں وقت پر پہنچ گیا۔ اگر میں نہ پہنچتا تو صبح لوگ وہاں سے تمہاری لاش اُٹھاتے وہ سب نشے میں تھے“.....

”اس نے مجھے دوسرے روز ملنے کے لیے کہا اور سکوٹر پر بٹھا کر مجھے میرے محلے کے قریب اتار گیا۔ میں نہیں بتا سکتی کہ مجھ میں یہ تبدیلی کیوں آئی کہ مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت ہونے لگی۔ شاید وہ جذبات ابھی مرے نہیں تھے جو انسان کو انسانیت کے دائرے میں پابند رکھتے ہیں۔ اس آدمی کا تھپڑ میرے منہ کو جلا رہا تھا اور اس کے ساتھ اُن چاروں کی یہ پھبتی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ”یہ اعلیٰ نسل کی کُتیا ہے“....

”میں جب اپنے گھر والی گلی میں داخل ہوئی تو مجھے یوں یقین کرنا مجھے

دیواروں سے بھی آواز سُنائی دے رہی تھی — ”یہ کُتیا ہے“ — اور اس کے ساتھ ہی اندھیرے میں سے کسی کا ہاتھ میرے منہ پر زور سے تھپڑ مارتا اور میں چکرا جاتی۔ اپنے دروازے پر دستک دی تو دروازہ بڑے بھائی نے کھولا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ اس کے کوئی دوست آئے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے ذرا نرمی سے ڈانٹا کہ میں اتنی دیر سے آئی ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ سہیلیاں پکچر پر لے گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ بڑے کام کا ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ ہمارے محکمے کا افسر ہے۔ اس کی بیوی مر گئی ہے۔ آؤ تمہارا تعارف کرا دوں“.....

”میں اچھے موڈ میں نہیں تھی۔ اس افسر کے سامنے جا کر ایکٹنگ کرنی پڑی۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چونکہ میرے بھائی کے محکمے کا افسر تھا اس لیے میں بڑے اچھے انداز سے اسے ملی..... تھوڑی دیر بعد میں لیٹ گئی لیکن نیند نہ آئی طبیعت جل رہی تھی۔ اندھیرے کمرے میں رہ رہ کر یہی ایک آواز سُنائی دیتی تھی — ”یہ کُتیا ہے“۔ اور میرے منہ پر تھپڑ کا درد تازہ ہو جاتا۔ عجیب بات ہے کہ اس درد میں مجھے لذت محسوس ہو رہی تھی۔ رات اسی بے چینی میں گزر گئی.....

”میں نے تمہیں اپنی چھوٹی بہنوں اور بڑے بھائیوں کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ باتیں بڑی لمبی ہو جائیں گی۔ صرف یہ بتاتی ہوں کہ میرے بڑے بھائی ابھی تک غیر شادی شدہ تھے۔ انہوں نے امیر کبیر اور اُونچے دو تین گھروں سے رشتہ مانگا تھا لیکن انہیں بڑا ہی ذلیل جواب ملا تھا۔ وہ لوگ ہمارے گھر کی اصلیت سے واقف تھے۔ وہ حرام کے پیسے سے متاثر نہ ہوئے۔ برادری میں بات چلانے کی کوشش کی تو وہاں سے بھی دھتکار دیئے گئے کیونکہ ہم پہ بدکاری کا اور محلے برادری والوں سے نفرت کرنے کا الزام

تھا۔ محلے والوں نے اپنی جوان لڑکیوں کو ہمارے گھر میں آنے سے منع کر رکھا تھا میں نے پہلے تو کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اب مجھے ایک دھکا لگا تو میرا دماغ کچھ روشن ہو گیا۔ مجھے اپنی حیثیت یہ نظر آنے لگی کہ محلے اور برادری میں میں بدکار تھی اور میرا سارا خاندان دھتکارا گیا تھا اور اپنی باہر کی سوسائٹی میں میں کُتیا تھی۔۔۔۔

"رات سخت بے چینی میں گزار کر دوسرے دن میں اُس سے ملی جس نے مجھے اُن چار کتوں سے چھڑایا تھا۔ وہ بھی پیتی تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ مجھے کسی ہوٹل میں لے جائے گا جہاں ہم دونوں وہی کھیل کھیلیں گے۔ میں اس کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ پہلی بار میرے اندر یہ احساس بیدار ہوا کہ مرد شکل و صورت کے حسن اور قیمتی کپڑوں سے اونچا نہیں ہوتا، اصل وصف، مردانگی ہے۔ اس میں مردانگی تھی۔ میں دل ہی دل میں اپنا آپ اس کے سپرد کر چکی تھی۔ مگر وہ ملا تو کسی ہوٹل میں لے جانے کی بجائے مجھے ایک باغ میں لے گیا اور ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس نے کوئی بیہودہ بات نہ کی بلکہ بڑی عام سی باتیں کرتا رہا۔ اس کے لہجے میں شوبازی نہیں تھی۔ یہ اس کا پیدائشی اور قدرتی رنگ تھا۔ مجھے اس کی باتیں اور لہجہ اچھا لگا۔۔۔

"اس کے بعد ہم ملتے رہے اور بے تکلف ہو گئے لیکن یہ بے تکلفی غلط نہیں تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میرا گھرانہ کیسا تھا اور وہاں دولت کس طرح آئی اور میں کس طرح گمراہ ہوئی۔ میں نے ایسی بات کبھی کسی سے نہیں کی تھی۔ میں تو اپنے آپ کو خاندانی لینڈ لارڈ بتایا کرتی تھی۔ اس شخص نے مجھ پر ایسا جادو کر دیا جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اسے اپنی اصلیت بتا دوں۔ اس سے مجھے عجیب سا قرار اور لطف محسوس ہوا

جیسے میں نے زہر اُگل دیا ہو۔ پھر ہم اسی طرح قدرتی رنگ میں باتیں کیا کرتے اور میری رُوح سچے پیار سے واقف ہوئی۔۔۔۔

"ہم دونوں نے ہوٹلوں وغیرہ میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اُن لوگوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دو دفعہ لڑکوں نے اس پر حملہ کیا۔ ایک بار وہ زخمی بھی ہو گیا۔ مجھے اغوا کی دھمکیاں دی گئیں۔ ہمارا پیچھا بھی کیا گیا اور یہ ہمارے لیے ایک خطرہ بن گیا۔ اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا کہ اپنے تین چار حمایتی خرید سکتا۔ مغرب کی آوارگی میں پڑے ہوئے ان نوجوانوں کا کردار اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کوئی قربانی نہیں کر سکتے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کا پیار بھی نہیں ہوتا۔ ان میں جن کے پاس پیسے ہوتے ہیں اور جو عیش کراتے ہیں وہ دوستوں کی ایک فوج اکٹھی کر سکتے ہیں۔ میرے ساتھی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کھانے والا تھا، کھلا نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس چرب زبانی اور ایکٹنگ تھی۔۔۔

"وہ والدین کا پہلا بچہ تھا جسے انہوں نے بہت زیادہ پیار سے بگاڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ہر ضد پوری کرا لیتا تھا۔ چار سال کا ہوا تو گھر میں دوسرا بچہ پیدا ہوا پھر ہر دو سال کے بعد ایک بچہ پیدا ہونے لگا۔ پہلا بچہ پیار کا اور ہر ضد پوری کرنے کا عادی تھا۔ اس کے لیے پیار نہ رہا۔ سکول داخل کرانے لگے تو وہاں سے بھاگ آتا۔ باپ نے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر استادوں نے بھی اس کی مار پٹائی شروع کر دی۔ گھر میں پانچ بچے ہو چکے تھے اور یہ بارہ سال کی عمر میں آوارہ ہو گیا۔ اس نے امیر گھروں کے لڑکوں کے ساتھ دوستی کر لی۔ انہیں اُلو بنا کر اُن سے پیسے بٹور لیتا اور عیش کرتا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ تجربہ کار دھوکہ باز بن چکا تھا۔ جوا بھی کھیلتا تھا۔

اس نے دو تین آوارہ لڑکوں کو پھانس لیا اور امیروں کے آوارہ اور نوجوان بیٹوں کو عیش کرانے لگا۔ پھر وہ ان کا دوست بن گیا اور زبان اور ایکٹنگ کے کمال سے ان کی جیبوں پر خوب عیش کرتا رہا.....

"مجھے اپنی اصلیت بتا کر وہ ایک روز رو پڑا اور کہنے لگا کہ مجھے سکون کہیں نہیں ملا۔ نہ شراب میں نہ چرس میں اور نہ لڑکیوں کے جسموں سے۔ پاگلوں کی طرح ناچ ناچ کر بھی میرے اندر ایک بیقراری موجود رہی اور میں پریشان ہی رہا۔ اُس نے کہا۔ "میں جس وقت تمہیں ان لوگوں سے چھڑانے جا رہا تھا تو مجھے امید تھی کہ ان سے مار کھاؤں گا لیکن معلوم نہیں مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ میں نے چاروں کو بھگا دیا۔ تمہیں ان سے بچا کر مجھے وہی سکون ملا جو میں ڈھونڈتا پھرتا تھا"....

"وہ میرا مشکور تھا کہ میں نے اسے محبت دے کر تباہی سے بچا لیا ہے لیکن دراصل مشکور میں تھی۔ اس نے ایک روز کہا۔ "ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دونوں بچے ہیں اور گھر کا راستہ بھول کر کسی جنگل میں اکٹھے ہو گئے ہیں"۔ وہ ٹھیک کہتا تھا.... اس کا اب کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اپنے ہی دوستوں سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ اپنے گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے تو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ مہینہ بھر نہ جائے تو بھی اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ میں اسے اپنے گھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ کچھ پیسے دے دیا کرتی تھی....

"میں کالج تو ایک عرصے سے نہیں گئی تھی۔ ایک روز بھائی نے مجھے یہ خبر سنائی کہ وہ میری شادی اُس ادھیڑ عمر افسر کے ساتھ طے کر چکا ہے جس کے ساتھ اُس

نے میرا اُس رات تعارف کرایا تھا جب میں اُن چار غنڈوں سے بچ کر گھر پہنچی تھی میں نے صاف انکار کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے مجھے منانے کی کوشش کی اور بتایا کہ اگر میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی تو وہ دونوں بھائیوں کو ترقی بھی دلا دے گا اور ایسی جگہ لگا دے گا جہاں وارے نیارے ہوں گے۔ میں نے بھائیوں کی ایک نہ سُنی۔ میرا یہ اُمیدوار مجھ سے چھبیس سال بڑا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا بیٹا میری عمر کا تھا۔ اگر مجھ میں انقلاب نہ آ گیا ہوتا تو میں اس بوڑھے کے ساتھ شادی کر لیتی۔ رسمی طور پر اس کی بیوی بنی رہتی اور دوستوں سے دل بہلاتی رہتی لیکن اب معاملہ کچھ اور تھا....

"میں نے صاف انکار کر دیا تو بھائیوں نے مجھے یہ دلیل دی کہ اپنی برادری میں کوئی مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں اور باہر کے لوگوں کو بھی ہمارے متعلق سب کچھ پتہ چل چکا ہے لہٰذا یہ موقع اچھا ہے۔ اچھی حیثیت والا ایک آدمی مل رہا ہے۔ میں نے یہ دلیل بھی نہ مانی تو بھائیوں نے مجھے زبردستی بیاہ دینے کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں اور مجھے گھر سے نکلنے سے منع کر دیا۔ میری ماں بھی بھائیوں کی حمایت کرتی تھی اور باپ بھی یہی چاہتا تھا کہ میں بھائیوں کی بات مان لوں۔ میں نہ مانی۔ مجھ پر پابندیاں عائد کر دی گئیں....

"میں اپنے والدین اور بھائیوں کی اس حماقت پر حیران ہوتی تھی کہ مجھے اتنی زیادہ آزادی دے کر مجھ سے کبھی یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ میں رات اتنی دیر تک رہتی کہاں ہوں۔ اور اب وہ سات سال بعد مجھ پر پابندیاں عائد کر رہے تھے۔ میں ایک روز باہر نکل گئی۔ اپنے ساتھی سے ملی اور اُس کے ساتھ پروگرام

طے کرلیا۔ رات کو بڑے بھائی نے پوچھا ــــ "تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" ـــ

میں نے جواب دیا کہ دن مقرر کرلو، میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ میرے بھائی اور ماں باپ بہت خوش ہوئے۔ انہیں میری بڑی اچھی قیمت ملنے کی آس لگ گئی ...

"میں نے دوسرے دن بھائی سے کہا کہ میں کپڑے اور زیورات اپنی مرضی اور پسند کے بنانا چاہتی ہوں اس لیے مجھے تین چار ہزار روپیہ دے دیں۔ دو روز بعد مجھے تین ہزار روپیہ مل گیا۔ مجھے باہر جانے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ میں نے سات سو روپیہ ماں کے سوٹ کیس میں سے نکالا۔ دن کے وقت اپنے ساتھی سے ملی اور اسی شام ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے اور جب صبح طلوع ہوئی تو میرا آبائی شہر بہت دُور پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں بالغ تھی۔ یہاں آکر ہم نے مجسٹریٹ کے سامنے جاکر شادی کرلی۔ پھر بڑی ہی اذیّت ناک تلاش کے بعد یہ مکان کرائے پر مل گیا۔ اب سوال نوکری کا تھا۔ اس کے لیے ہمیں بہت ہی ذلیل وخوار ہونا پڑا۔ اپنے پاس خاصی رقم تھی۔ وہ خرچ ہوتی رہی۔ ہم نے گھر کی کوئی چیز نہیں بنائی تاکہ نوکری ملنے تک رقم ختم نہ ہوجائے ...

"نوکری تلاش کرنے کے دوران مجھے جو تجربے ہوئے وہ ایک شرمناک کہانی ہے۔ مجھے نوکری مل سکتی تھی لیکن وہ لوگ مجھ سے جو قیمت مانگتے تھے وہ میں اب دینے کو تیار نہیں تھی۔ میرا مالک اب یہ آدمی ہے جس نے مجھے ان چار غنڈوں سے بچایا اور تھپڑ مار کر مجھے جگادیا تھا۔ اللہ غارت کرے ان لوگوں کو جن کے درمیان ہم رہتے ہیں۔ کسی نے ہم سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، اجنبی ہو، کسی چیز کی ضرورت ہو، تو ہمیں بتانا۔ ان لوگوں نے ہمیں شکی نگاہوں سے دیکھنا

شروع کردیا ...

"ایک روز یہاں کے دو بزرگوں نے میرے خاوند سے کہا کہ یہ شریفوں کا محلّہ ہے، یہاں شریفوں کی طرح رہنا۔ پھر ان جاہل لوگوں نے مجھے طوائف بنا ڈالا۔ ہم اپنے چکّر میں پڑے پریشان ہو رہے تھے۔ سارا دن در در کی ٹھوکریں کھاتے گزر جاتا تھا اور یہ لوگ ہماری مصیبت سے لاتعلّق ہمیں بدنام کیے جا رہے تھے۔ میرے لیے طوائف بننا کوئی مشکل نہ تھا لیکن مشکلات کا مقابلہ کرنے میں لُطف سا آتا تھا۔ ان کمبختوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں طوائف ہوتی تو اس اندھیری کوٹھڑی میں رہتی؟ تین مہینوں بعد میرے خاوند کو ڈیڑھ سو روپے کی نوکری مل گئی اور ڈیڑھ دو مہینوں بعد مجھے بھی ایک پرائیویٹ فرم میں جگہ مل گئی۔ اب ہم نئی زندگی بنا رہے ہیں۔ انشاء اللہ ایک دو مہینوں بعد کوئی اچھا سا مکان دیکھ کر اس غار سے نکل جائیں گے۔"

ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ پسند کرے گی کہ ہم یہ ساری تفصیل شائع کردیں جو اس نے سُنائی ہے۔ اُس نے کہا۔ "اسی لیے تو سنائی ہے، ہر ایک بات شائع کریں۔ میرا نام کسی کو نہ بتائیں اور یہ بھی نہ بتائیں کہ میں کہاں ہوں۔ اگر تم مجھ سے یہ پوچھو کہ کیا میں اس زندگی میں مطمئن ہوں تو میں جواب دوں گی 'نہیں'۔ میں کالج سے نکلتی تھی تو دو تین کاروں کے دروازے میرے لیے کُھل جاتے تھے۔ میں یورپین ہوٹلوں میں جاتی تھی تو امیرزادے میرے اردگرد منڈلاتے تھے۔ میں گناہ گار تھی مگر شہزادی تھی۔ اب دیکھ لو میں کہاں رہتی ہوں۔ یہ اُن گناہوں کی سزا ہے جو میں اطمینان اور سکون سے بُھگت رہی ہوں۔ البتہ یہ خوشی ضرور ہے کہ اب پاک ہوں۔ تم میری کہانی لکھو تو ضرور لکھنا کہ میں نے کوئی

خیالی قصہ نہیں سنایا اور نہ ہی یہ ماضی کی داستان ہے۔ یہ داستان ختم نہیں ہوئی۔ ذرا جا کر دیکھو کہ مجھ جیسی لڑکیاں کس طرح ہستی بنتی جا رہی ہیں۔ میں نے تمہیں راز کی ساری باتیں سنا دی ہیں۔ یہ راز قوم کے آگے رکھنا تمہارا کام ہے۔"

○ ○

پنجرے کے پنچھی

دروازہ تو کھل گیا لیکن ماں نے نہیں بھائی نے کھولا۔ میرے منہ پر اس کا وزنی ہاتھ پڑا، پھر ایک اور تھپڑ — اور بھائی نے لاتیں اور گھونسے مار مار کر مجھے بے ہوش کر دیا۔

راوی : زبیدہ

تحریر : شمیم اشتیاق

"اچانک آندھی آگئی۔ اس کے ساتھ بجلی چمکنے لگی۔ رات اندھیری تھی۔ میں قصبے سے دُور نکل گئی تھی۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ویرانہ تھا۔ آندھی اتنی تیز کہ پاؤں نہیں جمتے تھے۔ چیخیں ایسی جیسے میرے اردگرد چڑیلیں چیخ رہی ہوں۔ میں عورت ذات۔ طوفانی رات میں اکیلی۔ خوف سے غشی آنے لگی۔ دوسرا ڈر یہ کہ آج پکڑی جاؤں گی۔ اتنی تند آندھی نے میری یہ امید ختم کردی تھی کہ میں جس سے ملنے کیلئے اس ویرانے میں آئی تھی وہ مجھے مل جائے گا.... اور جب اندھیرے اور آندھی کے گردوغبار میں کسی نے میری کلائی پکڑ لی تو میری چیخ نکل گئی۔ پھر میرا جسم دو بازوؤں میں جکڑا گیا۔"

یہ منظر کسی خوفناک یا پُراسرار افسانے کا نہیں۔ یہ چار دیواری کی دنیا کی ایک سچی کہانی کا حصّہ ہے جو شاید آپ کو ناقابلِ یقین لگے لیکن ایسی کئی کہانیاں ہماری چار دیواری کی دنیا میں قید ہیں۔ ان میں ایک داستان زبیدہ کی ہے۔ اس کی عمر چوالیس سال ہوگئی ہے۔ مجھے اپنی ایک سہیلی اس کے گھر لے گئی تھی۔ زبیدہ کا

گھر متوسّط طبقے کا گھرانہ کہلا سکتا ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ ماں زندہ ہے، بہت بوڑھی ہوگئی ہے۔ زبیدہ اس کی بہت خدمت کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر ماں زندہ نہ ہوتی تو میں کبھی کی کچھ کھا کر مر چکی ہوتی۔ اس نے میری سہیلی کے ذرا سے اشارے پر اپنی آپ بیتی شروع کردی جو میں آپ کو اپنے الفاظ میں سناتی ہوں۔

اس کا ایک بڑا بھائی ہے۔ زبیدہ کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی جب ایک گھرانے کی طرف سے اس کے لیے پانچواں پیغام آیا۔ اس کے بڑے بھائی کی عمر بائیس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس کی عادتیں اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اسے کوئی رشتہ نہیں دیتا تھا۔ برادری زیادہ نہیں تھی اور جو چند ایک گھرانے تھے وہ زبیدہ کے بھائی کو جانتے تھے۔ اس کے مقابلے میں زبیدہ کو خدا نے شکل بھی اچھی دی تھی اور عادتیں شکل سے بھی زیادہ اچھی۔ اس کے لیے رشتے کے اور پیغام بھی آئے تھے لیکن والدین نے قبول نہیں کیے تھے کیونکہ وہ ایسا لڑکا چاہتے تھے جس کی بہن ہو اور جو زبیدہ کے بھائی کو مل جائے۔ وہ زبیدہ کے عوض اس کے بھائی کے لیے رشتہ لینا چاہتے تھے۔

پانچواں پیغام جس لڑکے کے لیے آیا اس کی پندرہ سال عمر کی ایک بہن تھی۔ زبیدہ کے والدین نے یہ شرط پیش کردی کہ رشتہ دو اور لو۔ لڑکی والوں نے جواب دیا کہ لڑکی چونکہ چھوٹی ہے اس لیے اس کی کوئی تیاری نہیں کی۔ جہیز کی ایک بھی چیز نہیں بنائی۔ زبیدہ کے والدین کو اس میں ایک اور فائدہ نظر آگیا۔ انہوں نے کہا کہ نہ تم جہیز دو نہ ہم جہیز دیتے ہیں۔ کچھ کپڑے اور تھوڑا سا زیور تیار کرلو۔ ہم سادگی سے شادی کردیں گے۔

زبیدہ کا رشتہ مانگنے والوں کو بھی اس شرط میں فائدہ نظر آیا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکیوں کے رشتے مانگنے والے لڑکی کو بعد میں دیکھتے ہیں پہلے جہیز کی فہرست دیکھتے ہیں۔ انہوں نے جب سُنا کہ ان کی لڑکی کو بیش قیمت جہیز کے بغیر قبول کر لیا جائے گا تو انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ اپنی پندرہ سالہ بیٹی جس بائیس سالہ آدمی سے بیاہ رہے ہیں، وہ کوئی کام دھندا نہیں کرتا۔ صبح گھر سے نکل جاتا اور رات کو آتا ہے۔ اس کی عادتیں ہی ایسی تھیں۔ گھر والوں کو اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ گھر میں پیسے لے آتا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کہاں سے لاتا ہے۔

زبیدہ نے ہمیں بتایا کہ وہ دراصل پولیس کے لیے مخبری کرتا تھا اور جوا بھی کھیلتا تھا۔ اس کا یارانہ چونکہ پولیس کے ساتھ تھا اس لیے وہ غنڈہ گردی بھی کرتا تھا۔ وہ بہت بدنام تو نہیں تھا لیکن اسے کوئی نیک نام بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

ایک مہینے بعد اس لڑکی کی ڈولی زبیدہ کے گھر آئی اور دو روز بعد زبیدہ کی ڈولی اس لڑکی کے گھر چلی گئی۔ یہ تبادلے کی شادیاں تھیں جسے وٹہ سٹہ کہتے ہیں۔ دونوں لڑکیوں کے والدین نے جہیز کے بوجھ سے بچنے کے لیے یہ تبادلہ کیا تھا مگر زیادہ غلطی زبیدہ کی کمسن بھابی کے والدین کی تھی جنہوں نے جہیز سے بچنے اور اپنی پسند کی لڑکی حاصل کرنے کے لیے اپنی کمسن اور معصوم سی بیٹی ایک مشکوک چال چلن کے آدمی کے حوالے کر دی۔

زبیدہ کا خاوند بھلا مانس نکلا۔ اس نے زبیدہ کو دل میں جگہ دی اور زبیدہ نے اسے اپنا مجازی خدا تسلیم کر لیا لیکن زبیدہ کی بھابی کا دل شروع میں ہی اُچاٹ ہو گیا۔ وہ ابھی بچی تھی۔ زبیدہ کے بھائی نے پہلے روز ہی اس کے ساتھ حیوانوں والا سلوک

کیا اور اسے یہ تاثر دیا کہ وہ اس کی رفیقۂ حیات نہیں اس کی لونڈی ہے۔ اس لڑکی کو سسرال میں آ کر پتہ چلا کہ اس کا خاوند کوئی باعزت آدمی نہیں اور نہ اس کا کوئی باعزت ذریعۂ آمدنی ہے۔ یہ لڑکی جسمانی لحاظ سے بھی نابالغ تھی اور ذہنی لحاظ سے بھی۔ ذہنی پختگی ہوتی تو وہ شاید خاوند پہ اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرتی۔ وہ صرف رو سکتی تھی اور روتی رہی۔ اسے اس گھر میں پیار ملا تو صرف زبیدہ سے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ یہ لڑکی زبیدہ کو اچھی لگتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ زبیدہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر یہ لڑکی بگڑ کر اپنے میکے بیٹھ گئی تو زبیدہ کو بھی میکے بٹھا لیا جائے گا۔

وہ کہتی ہے کہ اس نے وٹے سٹے کی شادیوں کے انجام دیکھے ہیں۔ زبیدہ نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اس کے بھائی کو انسان بنانے کی کوشش کرے لیکن گھر میں اس سے سب ڈرتے تھے۔ زبیدہ کا باپ تو اسے کچھ کہتا ہی نہیں تھا۔ باپ اسی پر خوش تھا کہ بیٹا چاہے کچھ ہی کرتا ہے، گھر میں پیسے تو دیتا ہے۔

باپ نے دوسری غلطی یہ کی کہ بیٹے کو اگر یہی کہہ دیتا کہ کچھ پیسے اپنی بیوی کو بھی دے دیا کر تو شاید یہ لڑکی خاوند کی حیوانیت اور بدنامی کو گوارا کر لیتی۔ اس نے اُلٹا یہ نظر رکھی کہ بیٹا اپنی بیوی کو پیسے نہ دے۔ وہ سارے پیسے اپنی جیب میں رکھنے کا عادی تھا۔ اس کی اس عادت نے لڑکی کو محتاجی کا احساس دلایا۔ خاوند کی خاطر بیویاں بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کر لیتی ہیں، بشرطیکہ خاوند بھی بیویوں کے جذبات اور ضروریات کا خیال رکھیں۔ یہاں خاوند کا سلوک ناقابلِ برداشت تھا۔

دوسری طرف زبیدہ اپنے سسرال میں مطمئن تھی۔ خاوند اسے چاہتا تھا۔ گھر کی ذرا ذرا بات بھی اسے بتاتا تھا۔ اسے الگ پیسے بھی دیتا تھا۔ وہ میکے آتی تو اس کے چہرے پر رونق ہوتی اور جب اس کی بھابی میکے جاتی تو وہ اداس ہوتی۔

زبیدہ نے اپنے پیار اور خلوص سے اسے اس قدر اپنے اثر میں رکھا کہ اس نے اپنے والدین سے کوئی شکایت نہ کی۔

ایک روز زبیدہ نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ کمسن لڑکی ہے، اس کے ساتھ وہ پیار اور شفقت سے پیش آیا کرے لیکن بھائی نے زبیدہ کی بات پر ذرہ بھر دھیان نہ دیا۔ زبیدہ نے اسے تنگ آ کر کہا۔ "جس روز اس لڑکی نے اپنے والدین کو بتا دیا کہ اس کے ساتھ یہاں کیسا سلوک کیا جا رہا ہے اس روز سے میرے ساتھ بھی وہاں ایسا ہی سلوک شروع ہو جائے گا اور میری اتنی اچھی زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

بھائی کو اپنے غنڈے پن پر ناز تھا۔ اس نے بہن سے کہا "جس روز انہوں نے تمہیں پریشان کیا، مجھے بتانا۔ پھر دیکھنا میں انہیں کس طرح اپنا غلام بناتا ہوں۔ وہ چکر دوں گا کہ ساری عمر یاد رکھیں گے۔"

زبیدہ کو یہی ڈر تھا۔ اسے اپنی بھابی کا نہیں بلکہ اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اگر وہ اسے خوش دیکھنا چاہتی ہے تو اس لڑکی کو خوش رکھے۔ زبیدہ کی ماں دانشمند عورت ہے۔ اس نے اپنی بہو کو اسی طرح سینے سے لگا لیا جس طرح زبیدہ کو لگائے رکھتی تھی۔ زبیدہ اور اس کی ماں کے پیار کا یہ اثر ہوا کہ لڑکی نے پورا ایک سال اپنے والدین کو پتہ نہ چلنے دیا کہ وہ خاوند کے ہاتھوں

تنگ ہے اور سسرال کے گھر میں اس کی کوئی قدر نہیں۔

اس وقت تک خاوند نے اس پہ ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ایک روز خاوند نے اسے بلاوجہ ڈانٹا تو لڑکی جو ایک سال سے بھری بیٹھی تھی پھٹ پڑی۔ اس نے خاوند کو دو چار سنا ڈالیں۔ خاوند نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ لڑکی میکے گئی۔ زبیدہ اپنے سسرال میں تھی۔ جب یہ لڑکی میکے گئی تو وہ اس قدر غصے میں تھی کہ اس نے اپنی ماں کو بتا دیا۔ ماں جل اٹھی۔ اس نے زبیدہ سے کہا۔ زبیدہ میں عقل بہت تھی۔ اس نے اپنے بھائی کو برا بھلا کہا اور لڑکی کی خوب تعریفیں کیں۔

زبیدہ کی ماں نے بھی عقل سے کام لیا۔ وہ زبیدہ کے سسرال گئی اور اپنی بہو کی ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ اس کی بہو نے اپنی ماں کو بتایا کہ اسے زبیدہ اور اس کی ماں کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔

تین مہینے اور گزرے تو زبیدہ کے گھر پہلی بچی پیدا ہوئی۔ اس کی بھابی کے ابھی ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ زبیدہ کے سسرال کو پتہ چل چکا تھا کہ ان کی بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔ یہ زبیدہ اور اس کی ماں کی عقلمندی تھی کہ انہوں نے بات بڑھنے نہ دی لیکن زبیدہ کا بھائی ذرہ بھر نہ بدلا۔

دو سال اور گزر گئے۔

زبیدہ نے ایک اور بچے کو جنم دیا۔ اس کی بھابی کے ابھی تک کوئی ایسے آثار نہیں تھے۔ وہ اب خاوند سے بہت تنگ آ چکی تھی۔ وہ جب میکے جاتی تو خاوند کو بتا جاتی کہ دو تین روز تک آ جاؤں گی لیکن پندرہ بیس روز رہ کر آتی۔ خاوند اسے پریشان کرتا۔ وہ اگلی بار اس سے بھی زیادہ دن میکے رہتی۔

ایک روز خاوند نے اسے کہا — "مجھے شک ہے کہ وہاں تُو نے کسی سے یارانہ لگایا ہوا ہے"۔

یہ ایسا الزام تھا جو لڑکی برداشت نہ کر سکی۔ وہ زبیدہ اور اس کی ماں کا پیار بھی بھول گئی۔ اگر وہ مرد ہوتی تو زبیدہ کے بھائی کو قتل کر دیتی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔ خاوند اسے مارنے کے لیے آیا لیکن ماں اور زبیدہ نے درمیان میں آ کر لڑکی کو بچا لیا۔

اس روز کی جھڑپ سنگین صورت اختیار کر گئی۔ خاوند نے کہہ دیا۔ "میرے گھر سے نکل جا۔ اگر یہاں آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا"۔

زبیدہ اپنے میکے تھی۔ اس کی بھابی جانے لگی تو زبیدہ نے اسے روکا لیکن اس کے بھائی نے زبیدہ کو پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ لڑکی چلی گئی۔ اس نے اپنے گھر جا کر بتایا کہ اسے خاوند نے نکال دیا ہے۔ زبیدہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ تھوڑی سی دیر کے لیے میکے آئی تھی۔ دونوں بچوں کو ساس کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ اگر وہ بھابی کے ساتھ ہی چلی جاتی تو شاید معاملہ اتنا نہ بگڑتا۔ وہ آج بھی اس غلطی پر پچھتا رہی ہے کہ وہ بھائی کو لعن طعن کرنے اور سمجھانے بجھانے کے لیے کیوں رک گئی تھی۔

لڑکی کے جانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد زبیدہ کے سسرال سے ایک تحریری پیغام آیا جو اس کے سسر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے زبیدہ کے بھائی کو لکھا کہ "تم نے میری بیٹی کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اب اپنی بہن کو اپنے گھر رکھو۔ بچے ہمارے پاس رہیں گے۔ اگر تمہاری بہن یہاں آئی تو ہم اسے باہر نکال دیں گے"۔

زبیدہ کو چکر آ گئے۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کا خاوند اسے اپنے گھر سے

کبھی نہیں نکالے گا۔ وہ اپنے سسرال جانے کے لیے فوراً اٹھی۔ اس کا بھائی جلانے والی لکڑی ہاتھ میں لے کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ تم میری بے عزتی کر رہی ہو۔ میں تمہارا سر کھول دوں گا۔

زبیدہ کا باپ بھی میدان میں آ گیا۔ اس نے بھی زبیدہ کو سسرال جانے سے روکا اور اپنے بیٹے کی طرح دھمکی دی۔ گھر میں شدید ہنگامہ ہوا۔ محلے کے لوگ آ گئے۔ ان میں عورتیں زیادہ تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ زبیدہ کو سسرال جانے دو۔ اس کی زندگی تباہ نہ کرو۔ سب نے زبیدہ سے کہا کہ وہ اپنے باپ کی پگڑی سسرال کے قدموں میں نہ پھینکے۔ مردوں نے یہاں تک کہا — "خاوند تو اور بھی مل جاتے ہیں۔ باپ اور بھائی نہیں ملتے"۔

یہ تماشائیوں کی آوازیں تھیں اور یہ ہر اُس گھر کے اردگرد منڈلانے لگتی ہیں جہاں کوئی گھریلو جھگڑا اکھڑا ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے اپنے مسائل اُلجھے ہوئے ہوتے ہیں وہ اسی قسم کے مشورے دے کر دوسروں کے مسائل کو بھی اُلجھا دیا کرتے ہیں۔

اگر اپنا صرف باپ اور بھائی ہوتا تو زبیدہ کوئی حل تلاش کر لیتی۔ وہاں تو پورے محلے نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا اور اسے یہی ایک آواز سنائی دینے لگی کہ باپ اور بھائی کی بے عزتی نہ کرو۔ زبیدہ اس امید پر دل پر پتھر رکھ کر بیٹھ گئی کہ دو چار دنوں میں یہ طوفان گزر جائے گا اور حالات معمول پر آ جائیں گے۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ حالات ساری عمر معمول پر نہیں آئیں گے اور وہ خاوند کے جیتے جی بیوہ ہو جائے گی۔

اس نے جو پہلی رات بچوں کے بغیر گزاری وہ اسے آج بھی یاد ہے۔ رات بھر

بے چین رہی۔ اُٹھ کر صحن میں ٹہلتی رہی اور ایک بار آنکھ لگی تو اسے خواب میں چھوٹا بچّہ روتا نظر آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور باقی رات کروٹیں بدلتے روتے یا صحن میں ٹہلتے گزار دی۔ دوسرے دن اس نے ماں سے کہا کہ وہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ماں نے اس کے باپ سے کہا۔ اس کے بھائی نے بھی سُن لیا اور کل والا ہنگامہ پھر شروع ہو گیا۔

گھر میں یہ سلسلہ چلتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ زبیدہ کو بلانے کوئی بھی نہ آیا نہ اسے بھائی اور باپ نے جانے دیا۔ ایک روز اس کے سسرال کے محلّے کی ایک عورت ان کے گھر آئی۔ ان کی اچھی راہ و رسم تھی۔ اس نے زبیدہ اور اس کی ماں کو بتایا کہ زبیدہ کے سسرال نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ زبیدہ کا چال چلن اچھا نہیں تھا اس لیے اسے گھر سے نکال کر ہم نے اپنی بیٹی کو اپنے گھر رکھ لیا ہے۔ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ یہ الزام زبیدہ کے خاوند نے عائد کیا ہے۔

زبیدہ کو یوں لگا جیسے بڑی زور کا بھونچال آیا ہو۔ اس نے پہلے تو تسلیم ہی نہ کیا کہ اس کا خاوند اس پر ایسا ذلیل الزام عائد کر سکتا ہے مگر اس عورت نے ایسے پُر اثر انداز سے باتیں کیں کہ زبیدہ کو ماننا پڑا کہ اس کے خاوند نے اس پر یہ الزام عائد کیا ہے۔ زبیدہ کا بھائی گھر تھا۔ اس نے یہ الزام سُنا تو چاقو لے کر بولا ——— ”میں اسے قتل کر دوں گا جس نے میری بہن پر یہ الزام لگایا ہے“ ——— ماں اور زبیدہ نے اسے بڑی مشکل سے روکا۔ باپ نے اسے اندر بند کر دیا مگر وہ کہتا رہا کہ وہ زبیدہ کے خاوند کو معاف نہیں کرے گا۔

زبیدہ کو تو اپنے خاوند سے یہ اُمید تھی کہ وہ اسے لینے آئے گا، لیکن اس نے

اسے بدنام کرنا شروع کر دیا۔ زبیدہ غم اور غصے سے پاگل ہونے لگی۔ اس کے دل میں یہ بھی آئی کہ وہ خاوند کے پاس جائے اور اسے وہ محبّت یاد دلائے جس کے وہ دعوے کیا کرتا تھا اور جا کر اس کا منہ نوچے لیکن وہ جانتی تھی کہ بھائی جانے نہیں دے گا۔ اب تو بھائی قتل پہ اُتر آیا تھا۔

زبیدہ کا دوسرا ردِّ عمل یہ تھا کہ اس کے دل سے بچّوں کی محبت بھی نکلنے لگی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ماں تھی۔ بچوں کو دل سے کس طرح اتار سکتی تھی؟ وہ تنہائی میں روتی اور کڑھتی رہتی۔ اس نے مجھے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بتائے۔ ——— ”کوئی مجھ سے پوچھے کہ پرندے کو جب پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے“ ——— میں اس کی اس حالت کو تفصیل سے بیان نہیں کر رہی۔ اگر آپ ماں ہیں تو آپ تصوّر کر سکتی ہیں کہ آپ کو بچّوں سے جبراً الگ کر دیا جائے تو آپ کا حشر کیا ہو گا۔

جیسا کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ زبیدہ اور اس کے خاوند کے درمیان صرف اس کا بھائی اور باپ حائل نہیں تھا، سارے محلّے کی عورتوں نے اس کے سسرال کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی۔ جو بھی آتی یہی کہتی کہ زبیدہ تیرا خاوند بڑا کمینہ ہے کہ تجھ کو بدنام کرتا ہے۔ کوئی اس کے سُسرال کو گالیاں دیتی۔

”اور مجھے پتہ چلا ....“ زبیدہ نے کہا ”کہ یہی عورتیں جو ہمارے گھر میں ہماری طرفداری کرتی اور میرے سُسرال کو گالیاں دیتی تھیں باہر جا کر مجھے بدنام کرتی تھیں۔ انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ زبیدہ ہے ہی بدچلن ورنہ اسے خاوند گھر سے نہ نکالتا۔“

یہ ایک چکر تھا جس میں زبیدہ آگئی۔ چار دیواری کے قید خانے کی عورتوں نے قید کی گھٹن کم کرنے کے لیے باتوں کے بتنگڑ بناتے اور جس تنازعہ کو وہ مِل جُل کر سلجھا سکتی تھیں اسے اور زیادہ پیچیدہ اور سنگین بنادیا۔ یہی تو ہمارے گھرانوں میں خرابی ہے کہ لوگ اپنے جھگڑے نپٹانے کی بجائے دوسروں کے جھگڑوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور تباہی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف دلچسپی لیتے ہیں اور جھگڑے کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے ہمدردوں کے روپ میں نت نئی باتیں پیدا کرتے ہیں۔ زبیدہ کے معاملے میں بھی یہی ہُوا۔ اس کا گھر محلے کی عورتوں کے لیے تماشہ گاہ اور تفریح کا ذریعہ بن گیا۔

جوں جوں بات پھیلتی جارہی تھی زبیدہ کے بھائی کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ محلے میں اس کے گھر کی جو بدنامی ہورہی ہے وہ زبیدہ کے سسرال کی کارستانی ہے وہ اکثر غصے سے پھنکارتا رہتا اور زبیدہ کو دھمکیاں دیتا رہتا کہ اس نے اگر خاوند کا نام بھی لیا تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔

انہی دھمکیوں میں پورے دو سال گذر گئے۔

اس دوران صرف ایک بار زبیدہ کے سسرال سے اس کے بھائی کو پیغام آیا کہ وہ ان کی بیٹی کو طلاق دے دے اور اپنی بہن کی طلاق لے لے مگر بھائی نے اس کا جواب دھمکی سے دیا۔ لہٰذا نہ طلاق دی گئی نہ لی گئی۔

اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی اُدھر اُجڑ کر بیٹھی تھی جو ساری عمر شادی نہیں کرسکتی تھی اور ایک عورت اِدھر بیٹھی تھی جو طلاق نہ ملنے کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کرسکتی تھی نہ اپنے بچوں سے مِل سکتی تھی۔ یہ ایک

باپ اور بھائی کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ تھا مگر ان کے سامنے اپنی "ناک" تھی، لڑکیوں کے مستقبل سے انہیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ زبیدہ اِتنا عرصہ گذر جانے کے بعد اس اذیت ناک زندگی کی کچھ کچھ عادی ہوگئی۔

اس کے بھائی نے ایک روز گھر والوں کو یہ خبر سُنائی کہ وہ گھر میں دوسری بیوی لارہا ہے۔ زبیدہ کہتی ہے کہ وہ لوفر اور لفنگا تھا۔ اسے عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ کمی صرف یہ تھی کہ اسے کسی شریف گھرانے کی لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ دو روز بعد وہ ایک عورت کو لے آیا۔ معلوم نہیں کہاں سے لایا تھا۔ کہتا تھا کہ باقاعدہ نکاح پڑھوایا ہے۔ اَدھیڑ سی عورت تھی۔ بھائی کے معیار پر پُوری اترتی تھی۔

زبیدہ کو اس سے یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ اس کے جواب میں اس کا خاوند بھی دوسری شادی کرلے گا۔ اس غم کے ساتھ اسے بچوں کا غم کھانے لگا اور جب اسے یہ خیال آتا کہ اس کے بچے بڑے ہوگئے ہیں تو اس کا دل خون کے آنسو روتا مگر وہ مجبور تھی۔

صرف ایک بار اُس نے پھر اپنے بھائی سے کہا کہ پیشتر اس کے کہ اس کا خاوند دوسری شادی کرلے وہ اپنے خاوند کے پاس چلی جائے۔

اس کے بھائی نے جواب دیا "جانا چاہتی ہو تو جاؤ لیکن یہ بتا دوں کہ دو روز کے اندر اندر بیوہ ہوکر واپس آجاؤ گی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

زبیدہ ڈر گئی۔ وہ خاوند کی جدائی برداشت کرسکتی تھی مگر اس کی موت برداشت سے باہر تھی۔ وہ دبک گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے سسرال کا کبھی نام نہ لیا۔ دل پر پتھر رکھ لیا اور یہ خبر سننے کے لیے تیار ہوگئی کہ اس کے خاوند نے دوسری شادی کرلی ہے۔

تھوڑا عرصہ اور گزر گیا۔ زبیدہ کی غم خوار صرف ماں تھی لیکن گھر میں اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ زبیدہ کے متعلق اس کے باپ اور بھائی کو یقین ہو گیا کہ اب وہ گھر میں مطمئن ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس کے باہر نکلنے پر جو پابندی تھی وہ ہٹا دی گئی۔

ایک روز ملتان سے اس کی ماں کے کسی قریبی رشتہ دار کی موت کی اطلاع آئی۔ ماں اور زبیدہ ملتان کے لیے روانہ ہوئیں۔ گاڑی میں بیٹھیں۔ ڈبے میں تھوڑی سی عورتیں بیٹھی تھیں۔ گاڑی چل پڑی۔ جب سٹیشن سے دور نکل گئی تو ایک اجنبی عورت نے زبیدہ سے کہا کہ وہ کونے میں بیٹھی ہوئی لڑکی اسے بلاتی ہے۔ زبیدہ نے دیکھا۔ وہاں سفید برقعے میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ زبیدہ اس کے پاس جا بیٹھی۔ اس عورت نے چہرے سے برقعہ اٹھایا تو وہ اس کے بھائی کی بیوی تھی۔ دونوں کے آنسو نکل آئے۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسری کا پیار ابھی تک زندہ تھا۔ زبیدہ نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی "عابدہ تمہارے بھائی جان نے دوسری شادی کر لی ہے؟"

"انہوں نے نہ شادی کی ہے نہ کریں گے" ـــــ عابدہ (زبیدہ کی بھابی) نے جواب دیا ـــــ "امی اور ابا جان انہیں کئی بار کہہ چکے ہیں کہ دوسری شادی کر لیں۔ رشتے بھی مل گئے تھے لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ شادی نہیں کریں گے۔ مجھے انہوں نے کہا تھا کہ میرے گھر میں زبیدہ ہی آئے گی۔ وہ بچوں میں مگن رہتے ہیں۔ انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے"۔ عابدہ نے یہ بھی بتایا۔ "تمہارے بھائی نے جب دوسری شادی کی تھی تو ہمیں دوسرے ہی دن پتہ چل گیا تھا۔ امی، ابا جان اور برادری کے لوگوں نے بھائی جان پر بہت زور دیا کہ وہ اس کے جواب میں ضرور شادی کریں لیکن وہ نہیں مانتے"۔

زبیدہ بہت روئی۔ اس کے دل میں یہ ارادہ بھی آیا کہ وہ ملتان سے واپس آ کر اپنے گھر جانے کی بجائے اپنے سسرال چلی جائے لیکن اسے اپنے بھائی کی دھمکی یاد آ گئی کہ اگر وہ خاوند کے پاس گئی تو وہ اس کے خاوند کو قتل کر دیگا۔

زبیدہ نے عابدہ سے کہا کہ ایک طرف تو تمہارے بھائی جان میرے سوا کسی اور کو گھر نہیں لانا چاہتے اور دوسری طرف انہوں نے مجھے بدنام کر دیا ہے کہ میں بدچلن ہوں۔ عابدہ نے یہ سن کر کانوں پر ہاتھ رکھے اور قسمیں کھائیں کہ اس کے بھائی نے کبھی ایسی بات نہیں کہی۔

زبیدہ نے اسے اس عورت کا نام بتایا جس نے سب سے پہلے زبیدہ کے گھر آ کر اسے بتایا تھا کہ اس کے خاوند نے اس پر بدچلنی کا الزام عائد کیا ہے۔ عابدہ نے زبیدہ کو بتایا کہ وہ عورت خود بدنام ہے اور لگائی بجھائی اس کا پیشہ ہے۔

زبیدہ فوراً سمجھ گئی کہ اس کے بھائی نے اس عورت کو استعمال کیا ہے مگر حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ اب مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ البتہ زبیدہ کی ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ وہ خاوند اور بچوں سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ اس نے عابدہ سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ عابدہ نے رحیم یار خان بتایا مگر زبیدہ کو بہت بعد میں پتہ چلا کہ عابدہ کسی آدمی کے ہمراہ گھر سے بھاگ کر جا رہی تھی۔ آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اس وقت عابدہ کی عمر بائیس تیئیس سال ہو چکی تھی۔ ساری زندگی اس کے سامنے تھی۔ اپنا مستقبل اسے اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ پہلے خاوند سے طلاق لیے بغیر وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ اسے عورت تو پندرہ سال کی عمر میں ہی بنا دیا

گیا تھا لیکن اس کی جوانی اب شروع ہوئی تھی۔ اسے اپنے والدین پر بھی غصہ تھا جنہوں نے اس کے بھائی کے لیے رشتہ لینے کے لیے اسے کمسنی میں ایک وحشی حیوان کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اپنے والدین کے گناہ کی سزا بھگت چکی تھی۔ اب اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔ اسے ایک غمخوار مل گیا تھا۔ اس سے دو چار ملاقاتیں ہوئیں اور وہ اُس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔

زبیدہ کی ماں نے عابدہ کو دیکھ لیا۔ وہ بھی اُن کے پاس جا بیٹھی۔ عابدہ سے پیار سے ملی۔ اسے جب ان باتوں کا پتہ چلا جو عابدہ زبیدہ کو سُنا چکی تھی تو وہ بھی رو پڑی۔

گاڑی چلتی رہی اور یہ تینوں دُکھ سُکھ کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر ملتان آگیا۔ وہ گاڑی سے اُتریں اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے عابدہ کو رخصت کیا۔ یہ آخری بار تھی کہ انہوں نے عابدہ کو دیکھا۔

وہ دونوں تیسرے روز ملتان سے واپس آئیں۔ زبیدہ نے ایک روز ماں سے کہا کہ وہ اپنے خاوند سے ملنا چاہتی ہے۔ ماں ڈر گئی لیکن اس نے زبیدہ کو جانے سے روکا بھی نہیں۔ یہ کہا کہ اس کے گھر نہ جائے۔ کوئی اور صورت پیدا کرے۔ صورت یہی تھی کہ خاوند جس فیکٹری میں کام کرتا تھا وہاں جا کر ملے۔ وہ فیکٹری کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اب بھی وہیں ہے۔ زبیدہ کو اس علاقے کا پتہ تھا جہاں فیکٹری تھی اور وہ فیکٹری کا نام جانتی تھی۔ اتفاق سے اُس کا بھائی ٹائیفائڈ سے بستر پر پڑا تھا۔ زبیدہ نے اپنے بھائی کی بیماری کا ذکر میرے سامنے ان الفاظ میں کیا۔

"بہنیں بھائیوں کے لیے جان بھی قربان کر دیا کرتی ہیں لیکن میرے منہ سے یہ

دُعا نکلی کہ یا خدا اِس وحشی کو اس دُنیا سے اُٹھا لے۔"

ماں نے ایک معقول بہانہ تراش لیا اور زبیدہ اس کے مطابق چلی گئی۔ اسے فیکٹری جلدی مل گئی اور اسے خاوند بھی جلدی مِل گیا۔ زبیدہ نے بُرقعہ چہرے سے ہٹایا تو اس کا خاوند سُن ہو کے رہ گیا۔ زبیدہ کا سارا جسم لرز گیا۔ خاوند اسے الگ لے گیا۔ زبیدہ کے کہنے کے مطابق وہ اس طرح ملے جیسے خواب میں مِل رہے ہوں یا جیسے ہم دونوں الگ الگ کال کوٹھڑیوں میں بند ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہوں۔ وہ اب اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ خاوند تو اسے الگ مکان میں رکھنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن زبیدہ کو ڈر تھا کہ اس کا بھائی اسے غنڈوں سے مروا دے گا۔

اس نے خاوند سے کہا کہ اکٹھے رہنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اس شہر سے بھاگ کر کہیں دُور چلے جائیں لیکن روزی کا معاملہ تھا۔ خاوند اپنے والدین کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا نہ جا سکتا تھا۔ زبیدہ کو بھی ان بوڑھوں کا خیال آگیا۔ زبیدہ نے عابدہ کے متعلق پوچھا تو خاوند نے اسے بتایا کہ وہ بتائے بغیر غائب ہو گئی ہے۔ زبیدہ نے اسے بتایا کہ وہ اسے گاڑی میں ملی تھی لیکن بھائی خاموش رہا۔

دونوں اکٹھے رہنے کی تو کوئی صورت نہ نکال سکے، البتہ اگلی ملاقات کا وقت اور جگہ طے کر لی۔ تین روز بعد ماں نے زبیدہ کے لیے ایسا ہی ایک اور بہانہ تراش دیا۔ اس کا بھائی ابھی تک ٹائیفائڈ میں پڑا تھا۔ زبیدہ چلی گئی۔ اس کا خاوند دونوں بچوں کو ساتھ لے آیا تھا۔ یہ جگہ ایک مزار تھا جہاں لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔

زبیدہ نے اپنے بچوں کو دیکھا تو چیل کی طرح اُن کو اکٹھے ہی دبوچ لیا لیکن

دونوں بچوں نے اسے نہیں پہچانا۔ وہ اتنے اتنے بڑے ہو گئے تھے۔ خاوند نے اسے پچھلی ملاقات میں بتا دیا تھا کہ بچے اپنی دادی کو ماں سمجھتے ہیں اور جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو انہیں بتایا جاتے گا کہ ان کی ماں ان کے بچپن میں مر گئی تھی۔ زبیدہ بچوں کو دیکھ کر اور انہیں سینے سے لگا کر آنسو ضبط نہ کر سکی۔ بچے بہت حیران ہوئے کہ یہ عورت کون ہے۔ ان کے باپ نے بچوں کو بھاگنے دوڑنے کے لیے بھیج دیا اور زبیدہ سے باتیں کرنے لگا۔

اگلی ملاقات اسی مزار پر ایک مہینہ بعد ہوئی۔ اب خاوند اکیلا تھا۔ اس نے زبیدہ کو بتایا کہ بچوں نے گھر جا کر دادی سے کہا کہ ایک عورت نے انہیں پکڑ کر پیار کیا تھا اور وہ روتی تھی۔ دادی نے بچوں کے باپ سے پوچھا کہ وہ کون تھی؟ اس نے جواب دیا۔ مزار پر کوئی آئی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بے اولاد ہے۔ میرے بچوں کو دیکھ کر ان سے پیار کرتی رہی پھر مزار کے اندر بیٹھ گئی اور روتی رہی۔

دادی نے آہ بھر کر کہا ”ہاں کوئی بے چاری بے اولاد ہو گی۔“

اس ملاقات میں میاں بیوی نے دل کی باتیں کیں۔ زبیدہ نے پوچھا کہ بچے کون سے سکول میں پڑھتے ہیں؟ خاوند نے اسے دونوں سکول بتا دیئے۔ یہ ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد زبیدہ چند بار اپنے بیٹے کے سکول کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور جب بچوں کو چھٹی ہوئی تو اپنے بچے کو دور سے دیکھتی رہی۔ اسی طرح دو تین بار وہ اپنی بچی کے سکول بھی گئی اور اسے بھی دیکھتی رہی مگر اس کے قریب نہیں گئی۔

سردیوں کی راتیں تھیں۔ لوگ کمروں میں سوتے تھے۔ مزار پر ایک اور ملاقات میں میاں بیوی نے رات کے ملنے کا پروگرام بنایا۔ زبیدہ کا بھائی صحت یاب ہو چکا

تھا۔ مقررہ رات، ماں نے زبیدہ کو گھر کے دوسرے دروازے سے نکال دیا۔ اس کا بھائی اور باپ دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ زبیدہ اپنے خاوند سے کھلے آسمان تلے یخ اندھیری رات میں ملی۔ لیکن صرف آدھے گھنٹے کے لیے۔ وہ زبیدہ کو گھر تک چھوڑ گیا۔

ماں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ زبیدہ خیریت سے اپنے بستر تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد ان کی چند ایک ملاقاتیں دو دو تین تین مہینے کے وقفے کے بعد دن کے وقت، مزار پر ہوئیں اور صرف ایک ملاقات آبادی سے دور ویرانے میں ہوئی۔ ماں زبیدہ کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھی۔

پھر ایک رات آئی۔ زبیدہ خاوند سے ملنے جا رہی تھی۔ آبادی سے نکل گئی تو اچانک آندھی آگئی۔ زبیدہ نے سنایا ”.... اور آندھی کے ساتھ بجلی چمکنے لگی۔ رات اندھیری تھی۔ میں قصبے سے دور نکل گئی تھی۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ویرانہ تھا۔ آندھی اتنی تیز کہ پاؤں نہیں جمتے تھے۔ چیخیں ایسی جیسے میرے اردگرد چڑیلیں چیخ رہی ہوں۔ میں عورت ذات۔ طوفانی رات میں اکیلی۔ خوف سے غشی آنے لگی۔ دوسرا ڈر یہ کہ آج پکڑی جاؤں گی۔ اس تند آندھی نے میری یہ امید ختم کر دی تھی کہ میں جس سے ملنے کے لیے اس ویرانے میں آئی تھی، وہ مجھے مل جائے گا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ گرد اتنی زور سے منہ پر لگتی تھی جیسے کوئی ریت اور مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر میرے منہ پر مار رہا ہو۔ اچانک کسی نے میری کلائی پکڑ لی۔ میری چیخ نکل گئی۔ پھر میرا جسم دو بازوؤں نے جکڑ لیا .....

”میرا سر ڈولنے لگا۔ مجھے اپنے منہ کے ساتھ لگے ہوئے کسی کے منہ سے آواز

سنائی دی۔ "زبیدہ"۔ میں نے بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ وہ میرا خاوند تھا۔ میں نے رو رو کر کہا ——— "خدا نے ہمیں کن طوفانوں میں پھینک دیا ہے" ——— میں اور وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے وہیں کھڑے رہے۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ جھکڑ بہت تیز تھا۔ اس نے کہا ——— "چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں" ——— مگر میں وہاں سے ہلنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اس طوفان میں اسے پکڑے رکھا۔ اچانک بجلی اتنی زور سے کڑکی کہ میں نے اسے چھوڑ دیا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "جلدی گھر جاؤ۔ بچے ڈر رہے ہوں گے۔ دوڑ کر جاؤ"۔ میں اسے دھکے دینے لگی لیکن وہ مجھے دوسری طرف لے جانے لگا۔۔۔۔

"ہم اتنی تیز بارش اور جھکڑ میں آبادی میں داخل ہوئے۔ اپنے محلے میں داخل ہو کر میں نے اسے کہا کہ تم جاؤ، میں چلی جاؤں گی۔ ہم کس طرح جدا ہوئے، یہ خدا سے پوچھو۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ چلا گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔۔۔۔ میں اپنے دروازے پر آئی۔ آہستہ سے دستک دی۔ مجھے معلوم تھا کہ ماں جاگ رہی ہو گی اور دروازہ کھول دے گی۔ دروازہ تو کھل گیا لیکن ماں نے نہیں بھائی نے کھولا۔ میرے منہ پر اس کا دزنی ہاتھ پڑا۔ پھر ایک اور تھپڑ۔ اور بھائی نے لاتیں اور گھونسے مار مار کر مجھے بے ہوش کر دیا۔۔۔۔

"ماں اسے بتا چکی تھی کہ میں خاوند سے ملنے گئی ہوں۔ اس لیے اسے یہ شک نہ ہوا کہ میں کسی غیر سے ملنے گئی تھی۔ رات گزر گئی۔ صبح کے وقت بھائی نے مجھ سے کہا ——— "میں تمہیں صرف ایک موقع دیتا ہوں۔ اگر اب تم اس سے ملنے گئیں تو وہ قتل ہو جائے گا" ——— میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ قتل

کرنا ہے تو مجھے قتل کرو۔ وہ میرے بچوں کا باپ ہے۔ میں قرآن کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اب اسے نہیں ملوں گی۔۔۔

"وہ رات اور آج کا دن۔ پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ شادی ہوئے بائیس سال گزر گئے ہیں۔ اس کے بعد خاوند کی صورت نہیں دیکھی۔۔۔۔ دس دن گزرے کسی نے بتایا کہ میری بیٹی کی شادی ہے اور آج دو بجے ڈولی جا رہی ہے۔ میں نے سب کچھ معلوم کر لیا۔ بھائی سے اجازت لی کہ میں دُور سے بیٹی کی ڈولی جاتے دیکھوں گی۔ بے شک میرے ساتھ چلے چلو۔ بھائی مان گیا۔ اس نے اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اپنے سُسرال کے گھر سے دُور سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ بہت دیر بعد محلے میں سے بارات نکلتی نظر آئی۔ وہ ایک بس تھی جس کی چھت پر جہیز کا سامان تھا۔ اگلی سیٹ پر میری دُلہن بیٹی بیٹھی تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی۔ دولہا بیٹے کو دیکھا تھا۔ مجھے بہت پیارا لگا تھا۔ اللہ میری بیٹی کا سہاگ ہرا کرے۔ اب اپنے بیٹے کی بارات جاتے دیکھوں گی"۔

زبیدہ کا باپ دو سال ہوئے مر گیا ہے۔ ماں بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ زبیدہ نے اپنی زندگی ماں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ اس کی بہت خدمت کرتی ہے اور اس کا بھائی جیسا تھا ویسا اب ہے۔ اس کے خاوند نے دوسری شادی نہیں کی۔

اُستانی اور ٹیکسی ڈرائیور

اب تانگے کی بجائے ایک ٹیکسی سکول کے باہر کھڑی ہوتی ہے۔ اُستانی ٹیکسی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے اور ٹیکسی اُسے لے جاتی ہے۔ کتنے لوگ اُنگلیاں دانتوں میں لے لیتے ہیں۔

راوی: حمیدہ بانو
تحریر: شمیم اور فردوس

جب ہماری اُستانی کے امیر کبیر اُمیدواروں نے سُنا کہ اُس نے ایک اَن پڑھ تانگے والے کے ساتھ شادی کر لی ہے تو اُنہوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ شادی کہاں کی ہے، یہ تو گناہوں پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہے۔ ہمیں تو پہلے ہی پتہ تھا کہ چالُو مال ہے۔ اب تانگے والے کو خاوند بنا کر دھندا اور پھیلائے گی۔

وہ آٹھویں جماعت میں ہماری اُستانی تھی۔ ہم نے بھی جب سُنا تھا کہ ہماری اُستانی نے ایک تانگے والے کے ساتھ شادی کر لی ہے تو افسوس ہُوا تھا کہ اتنی اچھی، اتنی پیاری اُستانی نے یہ کیا کیا؟ ہم اُس وقت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ بہت سی باتوں کو ہم نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ اُستانی سے پوچھنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ انہوں نے تانگے والے سے کیوں شادی کی ہے۔ ہم نے یہ کئی بار دیکھا تھا کہ چھٹی کے وقت کوئی سکوٹر والا یا کار والا اُن کے قریب رُک کر گاڑی پیش کرتا تھا۔ ہماری اُستانی مُسکرا کر شکریہ ادا کیا کرتی تھی۔ کبھی لفٹ قبول نہیں کی تھی۔ یہ دیکھ کر ہی ہمیں حیرت ہُوئی تھی کہ اُستانی نے کسی سکوٹر یا کار والے سے شادی

کیوں نہ کی۔

شادی کے بعد ہم نے دیکھا کہ چھٹی کے وقت باہر ایک تانگہ کھڑا ہوتا تھا۔ اُستانی باہر جا کر تانگے میں بیٹھ جاتی، تانگے والے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی اور تانگہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ یہ اُستانی کا اپنا تانگہ اور تانگے والا اُس کا خاوند تھا۔

اب چار سال بعد، تانگے کی بجائے ایک ٹیکسی سکول کے باہر کھڑی ہوتی ہے۔ اُستانی ٹیکسی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے اور ٹیکسی اسے جب لے جاتی ہے تو کئی لوگ انگلیاں دانتوں میں لے کر سوچنے لگتے ہیں "اتنی پیاری اُستانی۔ ایسا اُجڈ ڈرائیور!"

چار سال گزر گئے ہیں جب اُستانی نے تانگے والے سے شادی کی تھی۔ اُس وقت ہم آٹھویں میں تھیں، اب کالج کے تیسرے سال میں ہیں۔ باتیں جو آٹھویں جماعت میں ہماری سمجھ سے بالا تھیں۔ وہ اب کُھل کر ہمارے سامنے آگئی ہیں مگر ایک معمہ ابھی حل نہیں ہُوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اُستانی نے تانگے والے کے ساتھ شادی کیوں کی اور کیا لوگوں کے کہنے کے مطابق وہ "چالُو مال" ہے؟

ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے اچھے اخلاق کی اُستانی کی سکول سے باہر کی زندگی اتنی غلیظ ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے کالج میں "چالُو مال" ہر روز دیکھا کرتی ہیں۔ یہ امیر اور متوسط طبقے کی چند ایک لڑکیاں ہیں، جنہیں ماں باپ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں اور وہ کالج میں آ کر کسی سکوٹر یا کار والے کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ کالج میں ان کی باتوں سے اور حرکتوں سے آوارگی اور بدکرداری ظاہر ہوتی

ہے۔ وہ ہر بات فلمی مکالموں کی زبان میں کرتی ہیں۔ ان کی نمود و نمائش ماڈل گرل کی طرح ہوتی ہے اور ماں باپ کی "یہ گنواری" بیٹیاں ہم جیسی طالبات کو جو تعلیم اور اپنی عزت کو عزیز سمجھتی ہیں، پسماندہ اور گنوار کہا کرتی ہیں۔

ہماری آٹھویں جماعت کی اُستانی نے کبھی کوئی شوخی نہیں کی تھی۔ کوئی بیہودہ بات کبھی نہیں کی تھی اور جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، وہ مذہب پرست بھی تھی۔ اب جب کہ ہمارے شعور بیدار ہو چکے ہیں، ایک روز فردوس اور میں بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ہمارے سامنے سے ایک ٹیکسی گزری۔ ڈرائیور کے ساتھ ہماری اُستانی بیٹھی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ ڈرائیور مسکرا رہا تھا۔

فردوس نے کہا کہ ہماری اُستانی ہے۔ میں نے کہا "نہیں، کوئی اور ہو گی اُستانی ہوتی تو پچھلی سیٹ پر بیٹھتی۔ یوں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر ہنس نہ رہی ہوتی۔"

وہ ہماری اُستانی ہی تھی۔ میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی تھی۔ اسی روز ہم نے فیصلہ کیا کہ چلو اُستانی کے گھر چلتی ہیں۔ شاید یہ معمّہ بھی حل ہو جائے۔

اگلے اتوار فردوس اور میں اُستانی کے گھر چلی گئیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں کہنے لگیں — "کسی پرانی طالبہ کو دیکھتی ہوں تو اتنی خوشی ہوتی ہے جیسے اپنی بچّی کو دیکھ لیا ہو اور میں کہتی ہوں کہ یہ میرے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے ہیں۔"

گھر میں اُن کی بوڑھی ماں تھی اور دو بچّے۔ بڑے پیارے بچّے تھے۔ البتہ اُستانی کا گھر ہمیں اچھا نہیں لگا۔ گندی سی آبادی میں چھوٹا سا مکان ہے۔ دو کمرے ایک باورچی خانہ، غسل خانہ اور چھوٹا سا سٹور۔ اس مکان میں اُستانی کہتی ہیں یہی ایک خوبی ہے کہ ان کا اپنا ہے۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کر کے ہمیں یقین

ہو گیا کہ اُستانی اب ہمیں بچّیاں نہیں سہیلیاں سمجھ رہی ہیں اور ان کے ساتھ بے تکلفی سے بات کی جا سکتی ہے۔ انہیں بھی غالباً یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے ساتھ ہر قسم کی بات کی جا سکتی ہے۔

میں نے کسی تمہید کے بغیر ہی کہہ دیا — "آپ نے تانگے والے کے ساتھ شادی کیوں کی تھی؟ اور اب سنا ہے کہ آپ تانگے کی بجائے ٹیکسی پر سکول آتی جاتی ہیں؟ اپنا تانگہ چھوڑ کر آپ ٹیکسی میں کیوں آتی جاتی ہیں؟"

وہ ہنس پڑیں اور کہنے لگیں — "تانگے والا بھی میرا خاوند تھا اور یہ ٹیکسی ڈرائیور بھی میرا خاوند ہے۔"

ہمارے ذہن میں معمّہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔ جواب ایسا تھا کہ ذہن سے اگلا سوال ہی نکل گیا۔ پوچھیں تو کیا پوچھیں؟ کیا یہ ہماری اُستانی کی ہابی ہے کہ پہلے تانگے والے سے شادی کی پھر ٹیکسی والے سے کر لی۔ اب رکشا والے کی باری ہے۔ اس کے بعد بس ڈرائیور ہے۔ ہم پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

وہ ہماری حیرت کو سمجھ گئیں اور بولیں — "میں تمہیں یہ قصّہ شروع سے سناتی ہوں۔ تم دونوں تو صرف حیران ہوئی ہو۔ لوگ مجھے رُسوا بھی کر چکے ہیں۔ اگر تمہیں یہ بات نہ سُنائی تو تم بھی انہی لوگوں میں شامل ہو جاؤ گی جو مجھے بدنام کرتے پھرتے ہیں۔"

اس کے بعد جو قصّہ سامنے آیا اور جس کی ہم نے قابلِ اعتماد حلقوں سے تصدیق بھی کرائی یوں ہے:

اُستانی کا باپ تانگہ بان تھا۔ اس کی واحد اولاد یہی ایک لڑکی تھی جس کی پیدائش کے بعد ماں کے اندر کوئی ایسا نقص پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے اور کوئی اولاد نہ

ہو رہی۔ یہ ارادہ ماں کے دل میں آیا تھا کہ بچی کو پڑھائیں گے اور کسی اچھے گھرانے میں بیاہیں گے۔ گھر میں اور کوئی بچہ نہ ہوا تو ماں باپ کا سارا لاڈ اور پیار اس ایک ہی بچی کے حصے میں آیا لیکن ماں اور باپ نے اسے بگاڑا نہیں۔ پیار کے ساتھ تربیت بھی اچھی کی۔

سکول جانے کی عمر کو پہنچی تو سکول بٹھا دیا۔ بچی ذہین نکلی۔ باپ اسے اپنے تانگے پر لے جاتا اور چھٹی کے وقت تانگے پر گھر لے آتا۔ وہیں سے اس کے دل میں تانگے کا پیار گھر کر گیا۔ اُستانی کہتی ہیں "آج بھی تانگہ مجھے ہوائی جہاز سے زیادہ پیارا لگتا ہے"۔

اُستانی نویں جماعت میں پہنچیں تو باپ کا دمہ جسے وہ معمولی معمولی دوائیوں سے دباتا رہتا تھا، بگڑی ہوئی حالت میں اُٹھ آیا اور باپ تانگہ چلانے سے معذور ہونے لگا۔ آمدنی پہلے ہی کم ہو گئی تھی کیونکہ شہر میں رکشے اور ٹیکسیاں چل پڑی تھیں۔ کئی سڑکیں تانگوں کے لیے بند کر دی گئی تھیں اور گھوڑے کا چارہ مہنگا ہو گیا تھا۔ اب تانگہ کئی کئی دن کھڑا رہتا۔ باپ کو ذرا سا افاقہ ہوتا تو تانگہ جوت لیتا اور اتنے پیسے کما لیتا جس سے گھوڑے کا اور گھر والوں کا پیٹ دو چار دن کے لیے بھر جاتا۔ دوائیوں کا خرچ الگ تھا جو صرف خرچ ہی تھا، ان سے افاقہ جو ہوتا تھا وہ محض عارضی تھا۔ اُستانی کی تعلیم کے اخراجات بھی تھے۔ اُستانی نے اپنے اخراجات ٹیوشن سے پورے کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی بستی میں تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ بستی سے باہر اُستانی کسی کو جانتی پہچانتی نہیں تھی۔ ٹیوشن کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ البتہ ان کی ہیڈ مسٹریس نے ان کی یہ مدد کی کہ ان کی فیس معاف کر دی اور ان کے شوق اور ذہانت سے متاثر ہو کر انہیں دس روپے ماہوار وظیفہ دینے لگی۔ لہٰذا تعلیم کا سلسلہ چلتا رہا۔

باپ کے جب دمے کے دوروں کا سلسلہ تیز ہو گیا تو تانگہ پورا مہینہ کھڑا رہنے سے گھوڑا سفید ہاتھی بن گیا۔ اُستانی کے چچا کا ایک بیٹا جوان تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ خالہ کے گھر رہتا تھا۔ وہ بھی تانگہ چلاتا تھا لیکن آوارہ ہو گیا تھا۔ چرس بھی پیتا تھا۔ تانگہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ اُستانی کے باپ نے اسے بلوایا اور تانگہ اس کے حوالے کر کے کہا کہ وہ چاہے تو اسی گھر میں آ جائے۔

وہ آ گیا اور اس نے تانگہ سنبھال لیا۔ وہ اُستانی سے تین چار سال ہی بڑا تھا۔ اس سے گھر میں یہ فرق پڑا کہ دال روٹی چلنے لگی۔ دینو (اُستانی کا چچا زاد) اپنا حصہ رکھ لیتا جو وہ اُجاڑ دیتا تھا اور باقی پیسے اُستانی کے باپ کو دے دیتا تھا۔ وہ کورا اَن پڑھ تھا۔

اُستانی کا میٹرک کا امتحان آ گیا ــــ اور امتحان کے دوران اُن کا باپ مر گیا۔ یہ اُن کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ اسی میں انہوں نے امتحان دیا۔ اُن کے آخری تین پرچوں میں ان کے آنسو بھی شامل تھے۔ پرچے دیکھنے والوں نے شاید کچھ نمبر اس لیے کاٹ لیے ہوں کہ لڑکی لاپرواہ ہے۔ پرچوں پہ پانی ٹپکاتی رہی ہے۔ تاہم انہوں نے ۵۹۱ نمبر دے ہی دیئے۔

باپ کے مرتے ہی دینو زیادہ آوارہ ہو گیا۔ تین تین دن تانگہ واپس ہی نہیں لاتا تھا۔ چند دن گھر میں کچھ پیسے دیئے۔ پھر وہ بھی بند۔ اب ماں کے سامنے ایک ہی مسئلہ تھا کہ بیٹی کو کسی اچھے گھر میں بیاہ دے مگر پاس پلے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے پاس ہانڈی روٹی کرنے اور برتن مانجھنے کے سوا کوئی ہنر نہیں تھا۔ اس کی بستی میں جو لوگ رہتے تھے وہ کسی کو گھر میں نوکر رکھنے کے قابل نہیں تھے بلکہ ان کی اپنی

عورتیں کھاتے پیتے گھروں میں کام ڈھونڈتی رہتی تھیں۔

اُستانی کی ماں بھی ایک روز بستی سے باہر کی دُنیا میں چلی گئی۔ دو گھروں میں اپنی بپتا اور ضرورت سُنائی تو اُسے دونوں گھروں میں جھاڑو پونچھ اور برتن کپڑے دھونے کا کام مل گیا۔ اس عورت نے اپنے گھر میں خاوند کی کمائی پر راج کیا تھا، اب دوسرے گھروں کے جھوٹے برتن اور گندے کپڑے دھونے لگی۔

اُستانی نے تین ٹیوشنیں ڈھونڈ لیں۔ ان سے کُل ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے۔ وہیں سے ایک بڑے گھر کا راستہ معلوم ہو گیا۔ وہاں گئی تو ایک ہی ٹیوشن پچاس روپے کی مل گئی۔ اس ٹیوشن کی وجہ سے اُستانی کوٹھیوں کی دُنیا میں پہنچ گئیں جہاں ان پر اپنے متعلق چند انکشافات ہوئے۔ مثلاً یہ کہ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ ان کے بال جادو جگاتے ہیں۔ آنکھیں بڑی پیاری ہیں۔ سیاہ برقعے میں ان کا چہرہ اور زیادہ نکھر آتا ہے۔

ایسے انکشاف کرنے والا پہلا نوجوان اُس بچے کا بھائی تھا جسے اُستانی پڑھانے جاتی تھیں۔ اس وقت تک اُستانی نے اس کے سوا کبھی اپنے متعلق سوچا ہی نہ تھا کہ وہ نوجوان لڑکی ہے اور جب گھر میں کافی پیسے ہو جائیں گے تو اس کی شادی ہو جائے گی۔ باپ کی موت اور اب جینے کی جدوجہد نے انہیں رومانی باتیں سوچنے کی کبھی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اس امیرزادے نے انہیں بتا دیا کہ وہ بہت خوبصورت ہیں تو ان کے اندر پیاری سی ہلچل پیدا ہونے لگی۔

یہ لڑکا انہیں ایک بار سکوٹر پر اور ایک بار باپ کی کار پر گھر چھوڑ آیا اور ایک شام وہ پھر اس کی کار میں بیٹھ گئیں۔ کار کا رُخ اُن کے گھر کی بجائے اُس طرف ہو گیا

جدھر ویرانہ تھا۔ اُستانی نے پوچھا تو لڑکے نے ہنس کر ٹال دیا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔

کار ایسی جگہ رُک گئی جہاں ارد گرد کوئی آبادی نہیں تھی۔ لڑکے نے پہلے تو فلمی مکالمے بولے جو اُستانی کو بُرے نہ لگے مگر لڑکا جب بہت بُری حرکت پر اُتر آیا تب اُستانی کو ہوش آیا۔ ہوش کے ساتھ غصّہ بھی آیا لیکن وہ لڑکی تھیں اور بے آسرا بھی تھیں۔ اس امیرزادے کے گھر سے انہیں پچاس روپے بھی ملتے تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کر وہ غصّہ پی گئیں اور بڑے اچھے انداز سے اسے ٹال دیا۔ وہ اس وعدے پر مطمئن ہو گیا۔

اُس رات گھر جا کر اُستانی نے بہت سوچا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سمجھ گئیں کہ اس لڑکے کے دل میں محبت نہیں شیطان ہے۔ اگر محبت ہوتی تو بھی وہ ایسا خواب تو نہیں دیکھ سکتی تھیں کہ اس کے ساتھ ان کی شادی ہو جائے گی۔ وہ پچاس روپے ماہوار کی قربانی بھی نہیں دے سکتی تھیں۔ انہوں نے ٹیوشن جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور وہاں جاتی رہیں۔

اس لڑکے نے انہیں تحفے اور نقد پیسے پیش کرنے شروع کر دیئے جو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے ساتھ انہوں نے سکوٹر اور کار کی لفٹ لینے سے بھی انکار کر دیا۔ پھر ایک روز انہیں اس لڑکے کو یہ دھمکی دینی پڑی کہ میں تمہارے والدین کو بتا دوں گی۔

یہ سلسلہ اس ایک امیرزادے تک محدود نہیں تھا۔ اُستانی کو امیروں کی اس بستی کے ایک بس سٹاپ پر خاصی دیر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ وہاں بھی انہیں لفٹ

دینے والے پہنچ جاتے تھے۔ یہ دُبلے پتلے، مریل سے امیرزادے تنہا لڑکی کو دیکھ کر رستم بن جاتے تھے لیکن انہیں رستم بنانے والیاں بھی مل جاتی تھیں۔ انہی کی طرح کی امیرزادیاں جو کوٹھیوں سے غالباً اسی لیے بن ٹھن کر اور اپنے جسموں کو زیادہ سے زیادہ ننگا کر کے باہر نکلتی تھیں کہ انہیں کوئی لفٹ دے۔ وہ بے حیائی سے مسکرا کر کسی کے سکوٹر کے پیچھے یا کار میں غیر مرد کے ساتھ بیٹھ جاتی تھیں۔ اُستانی جب اس ماحول میں بس کے انتظار میں جا کھڑی ہوتی تھیں تو وہ بُرقعے کے باوجود اپنے آپ کو عُریاں محسوس کرنے لگتی تھیں۔

انہیں دو اور چاہنے والے مل گئے۔ کبھی ایک ان کے پیچھے پیچھے چل پڑتا، کبھی دوسرا۔ یہ دونوں کوئی بیہودہ بات نہیں کہتے تھے۔ دل کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ رانی بنانے کے وعدے کرتے تھے۔ حُسن اور جوانی کی تعریفیں کرتے تھے اور دُور تک ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ان میں سے ایک نے ایک بار سکوٹر پر اُن کے گھر تک پیچھا کیا۔ اس سے اسے پتہ چل گیا کہ لڑکی غریب گھرانے کی ہے۔ وہ زیادہ دلیر ہو گیا۔

ایک شام اس نے اُستانی کو روک لیا۔ بدتمیزی کی کوئی بات نہیں کی بلکہ کہا کہ تم تو موتی ہو، کوڑے کرکٹ میں پڑی کیا کر رہی ہو۔ آؤ تمہیں اپنی کوٹھی دکھاؤں۔ میں بدکار نہیں۔ اپنے والدین سے تعارف کراؤں گا۔ ممی تو تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔ وہ تو چاہتی ہی یہی ہیں کہ گھر میں میرے لیے کسی شریف اور خوبصورت لڑکی کو لائیں۔ خدا کی قسم ہماری سوسائٹی میں کوئی لڑکی شریف نہیں اور خوبصورتی تو سب کی مصنوعی ہے۔ میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔

اُستانی نے اس وقت تک ان مردوں کی ذہنیت کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے اس نئے عاشق کو دھتکارنے کی بجائے یہ کہا۔ "مجھے ابھی کچھ عرصے کے لیے خاوند نہیں بلکہ ایک بچہ چاہیے، جسے میں پڑھا کر پیسے کما سکوں۔ مجھے کوئی ٹیوشن دلا دو۔"

وہ جانتی تھیں کہ یہاں غصّہ اور احتجاج بیکار ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اُٹھاؤ اور اپنے کردار کے مطابق اپنی عزّت بچائے رکھو۔ اس طرح انہیں ایک اور ٹیوشن مل گئی اور ایک اور چاہنے والا۔

گھر میں دینو کبھی کبھی آتا تھا اور تھوڑے سے پیسے دے جاتا تھا۔ ماں دو گھروں میں کام کر رہی تھی۔ اُستانی کی ٹیوشنیں پچھلے پہر تین بجے شروع ہوتیں اور رات نو بجے ختم ہوتی تھیں۔ تین بجے تک ہانڈی روٹی اُستانی کر دیتی تھیں گھر کی جھاڑ پونچھ بھی کر دیتی تھیں، اس لیے ماں کو گھر کا کوئی فکر نہیں ہوتا تھا۔ ماں بیٹی جہیز بنانے میں مصروف رہیں اور دو سال گزر گئے۔ اب تو اُستانی کی خوبصورتی اور جوانی نکھر کر سامنے آ گئی۔ دیکھنے والے پہلے سے زیادہ کھچنے لگے۔

ایک روز شادی کا پہلا پیغام آیا۔ یہ ایک کاروباری آدمی تھا۔ ایک بیوی مر چکی تھی۔ دوسری کو طلاق دے چکا تھا۔ عمر چالیس کے قریب تھی۔ دو بچّے تھے۔ اس نے اُستانی کو کہیں دیکھ لیا تھا اور یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ یہ غریب گھرانہ ہے۔ اس نے یہ پیش کش کی تھی کہ کسی کو پتہ چلے بغیر اتنی رقم دے دوں گا، جس سے بہت سا جہیز بن جائے گا۔

ماں کو یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔ اس نے بیٹی سے بات کی تو بیٹی ہنس

پڑی لیکن یہ خیال بیٹی کے دل میں بیٹھ گیا کہ وہ بہت قیمتی چیز ہے اور وہ منہ مانگی قیمت لے کر اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے سکتی ہے۔ ایک روز دینو گھر آیا تو ماں نے اسے کہا کہ دینو کچھ ہوش کر۔ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ زیادہ پیسے دبا کر۔ اس کا کچھ کر دوں۔ اب تو پیغام بھی آنے لگے ہیں۔

دینو نے حیران سا ہو کے جواب دیا۔ "جہیز کیسا؟ کیسے پیغام؟ کیا تم حمیدہ کو باہر دے رہی ہو؟ میں مر گیا ہوں کیا؟ مجھے تایا (اُستانی کے مرحوم باپ) نے کہا تھا کہ میرا تانگہ سنبھال لے۔ لڑکی جوان ہو رہی ہے۔ اسے بھی تو ہی سنبھالے گا اور اب یہی تیرا گھر ہے" — یہ کہہ کر اُس نے کہا — "دیکھ تائی، حمیدہ کے رشتے کی بات کہیں پکّی نہ کر دینا ورنہ مجھ سے بُرا اور کوئی نہ ہو گا۔ حمیدہ کی ڈولی اس گھر سے باہر نہیں جائے گی۔"

اُستانی کی ماں دینو کو جانتی تھی کہ وہ لوفر لفنگا اور چرسی بھنگی ہے۔ غنڈہ گردی بھی کر گزرے گا۔ پھر بھی اس نے دینو سے کہا کہ بیٹا، ذرا خود ہی سوچو، حمیدہ میٹرک پاس ہے اور تم اَن پڑھ ہو۔ پھر اپنی عادتیں دیکھو۔ میں تو دل میں یہ ارمان لیے بیٹھی ہوں کہ اتنی اچھی بیٹی کو کسی بہت ہی اچھے گھرانے میں بیاہوں گی۔ تمہارا تو کوئی بھروسہ ہی نہیں۔ ہمیں نہ تم نظر آتے ہو نہ تانگہ۔

دینو نے کہا — "تانگے والے کی بیٹی بی۔ اے پاس کر لے تو بھی تانگے والے کی ہی بیٹی کہلائے گی اور کسی تانگے والے کے ہی گھر جائے گی۔ تم خواب دیکھنے چھوڑ دو۔ میں اپنی عادتیں چھوڑ دوں گا۔"

ماں پریشان ہو گئی۔ اس نے بیٹی سے بات کی تو اس نے عادت کے مطابق

ہنس کر ٹال دیا اور کہا — "وہ مذاق کرتا ہے۔ ایسی بات تو اسے سوچنی ہی نہیں چاہیئے۔"

مگر دینو صرف یہی نہیں وہ تو بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ اس کا اُستانی کو دوسرے دن پتہ چلا۔ ماں گھروں میں کام کرنے چلی گئی تھی۔ اُستانی گھر میں اکیلی تھیں۔ دینو آ گیا۔ اُستانی سے کہا — "تمہاری ماں کہتی ہے کہ تمہارا رشتہ باہر دے گی۔ مجھ میں کونسا عیب ہے حمیدہ؟"

"تمہیں اپنے کسی عیب کا پتہ نہیں؟" اُستانی نے اس سے پوچھا — "تم جوا نہیں کھیلتے؟ چرس نہیں پیتے؟ لفنگ بازی نہیں کرتے؟ ہمیں تانگے کا حصہ دیتے ہو؟ اگر تم صرف اَن پڑھ ہوتے تو میں تم سے آگے کسی کو اچھا نہ سمجھتی۔ تمہیں تو اتنی سی شرم بھی نہیں آتی کہ میری ماں لوگوں کے گھروں میں نوکری کر رہی ہے۔ میں دردر پر پیسے کمانے کے لیے جھک مار رہی ہوں۔ تمہیں ہمارے دُکھوں سے واسطہ نہیں تو رشتے سے بھی کوئی واسطہ نہ رکھو۔"

دینو بھڑک پڑا اور دھمکیاں دینے لگا۔

اُستانی نے اُسے کہا — "میں دس جماعتیں پاس ہوں دینو۔ تو سفید اَن پڑھ ہے۔ ذرا اپنی شکل دیکھ۔ مجھے ایک سے ایک اچھا رشتہ مل رہا ہے۔ چاہوں تو کسی کار والے سے رشتہ جوڑ لُوں۔ تجھے تو میں اپنا نوکر بھی نہ رکھوں۔ نوکر بھی رکھوں گی تو کسی چرسی اور جواری کو نہیں رکھوں گی۔"

دینو بُجھ گیا اور سر جُھکا کر باہر چلا گیا۔ اُستانی نے ہمیں سُنایا کہ اس کی دھمکیوں سے میرے دل میں یہ خیال آ گیا تھا کہ مجھے تو کاروں اور کوٹھیوں والے امیرزادے چاہتے ہیں۔ میں خوبصورت بھی ہوں۔ تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ ایک دولت مند مجھے جہیز

تک کی پیش کش کر چکا ہے۔ میں جب راستے سے گزرتی ہوں کئی مرد مجھے دیکھنے کے لیے رُک جاتے ہیں تو کیا میرے لیے یہی تانگے والا چہ سی ہی رہ گیا ہے، میں نے اسے ایسے ایسے طعنے دیئے کہ اس کی ساری غنڈہ گردی ٹھنڈی کر دی۔ وہ باہر نکل گیا۔ اس کے دو روز بعد کا ذکر ہے کہ وہ بالکل اُس وقت آگیا جب میں ٹیوشن پڑھانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی۔ باہر تانگہ کھڑا تھا۔

دینو نے کہا ــ " کہاں کہاں جایا کرتی ہو، تانگہ لایا ہوں "۔ اس کی زبان میں کوئی تیزی اور تُرشی نہیں تھی۔ بالکل بجھا ہُوا تھا۔

میرے جی میں آئی کہ انکار کر دوں لیکن اس کی برخورداری کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے پانچ جگہوں پر جانا ہے۔ صرف ایک جگہ تک لے چلو اور فلاں جگہ سے نو بجے لے آنا۔

اس نے راستے میں اُستانی سے کوئی بات نہیں کی۔ ٹیوشن والے پہلے گھر تک اسے لے گیا اور رات آخری گھر کے سامنے سے لے آیا۔ اُستانی ڈرتی رہی کہ یہ غنڈہ ہے کہیں اور ہی نہ لے جائے لیکن وہ چُپ چاپ اسے گھر لے گیا۔ پھر وہ ہر روز اُستانی کو تانگے پر لے جاتا اور رات کو لے آتا۔ اُستانی اس سے کوئی بات کرتیں تو وہ یُوں چُپ رہتا جیسے بہرہ اور گونگا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتا کہ اُستانی کی طرف خالی خالی سی نظروں سے دیکھتا اور پھر سامنے دیکھنے لگ جاتا۔

پھر ایک انقلاب آگیا اور اچانک ہی آگیا۔ ایک بڑے اچھے گھرانے سے پیغام آگیا۔ لڑکا مشرقِ وسطیٰ کے ایک ملک میں ملازم تھا۔ چھ ماہ کی چُھٹی لے کر

آیا تھا۔ وہ لڑکا انہیں اٹھائیس سال کی عمر کا آدمی تھا۔ چند معزز آدمیوں اور عورتوں نے بہت ہی جلدی رشتہ بھی طے کروا دیا اور شادی بھی کروا دی۔ شادی بڑی سادگی سے ہُوئی۔ ماں بیٹی نے جو پیسہ بچا رکھا تھا اس سے تھوڑے سے کپڑے اور زیورات بھی بن گئے۔ اتنے پیسے والے گھرانے نے اس پر بھی ناک بھوں نہ چڑھائی کہ لڑکی کی ماں دو گھروں میں برتن مانجھتی ہے۔ انہیں ہماری اُستانی اتنی پسند آئی کہ کسی کمی بیشی کی پرواہ ہی نہ کی۔ دینو شادی کے انتظام میں دلچسپی لیتا رہا اور ڈولی کے ساتھ ہی تانگہ لے کے غائب ہو گیا۔

اُستانی کو خاوند پسند آگیا۔ سُسرال میں روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ طے ہُوا کہ خاوند اسے اپنے ساتھ ملک سے باہر لے جائے گا مگر ایک اور ڈرامے سے پردہ اُٹھا۔ اُستانی ماں کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ ایک روز ایک بڑی تیز طرّار اور فیشن ایبل عورت ان کے گھر آئی۔ جوان تھی۔ اس نے اُستانی اور ان کی ماں سے کہا کہ تم غریب لوگ ہو، ہمارا ایک ہلہ بھی برداشت نہیں کر سکو گے۔ میں اس آدمی کی بیوی ہوں جسے تم نے داماد بنایا ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اتنے بڑے گھرانے نے تمہاری یہ جُھگی اور حیثیت بھی نہیں دیکھی اور شادی کر لی، اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ آدمی چالباز ہے۔ جب سے باہر گیا ہے مجھے لکھ رہا ہے کہ تمہیں بُلا لوں گا۔ لیکن بلاتا نہیں۔ میں اب پُرانی ہو گئی ہوں نا! سال بعد تم بھی پُرانی ہو جاؤ گی۔ یہ دولت کا کھیل ہے۔ لیکن میں تمہیں بھڑکانے کے لیے یا تم سے عرض کرنے کے لیے نہیں آئی کہ ابھی اس سے طلاق لے لو۔ میں تمہیں خبردار کرنے آئی ہوں کہ میرے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اُستانی اور اس کی ماں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ماں اُن عورتوں کے پاس گئی جنہوں نے رشتہ طے کروایا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ صحیح ہے کہ تمہارے داماد کی پہلی بیوی ہے لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بداخلاق عورت ہے۔ خاوند اسے باہر لے جانا چاہتا ہے لیکن وہ نہیں جاتی۔ اس کی غیر حاضری میں یہاں عیش کرتی ہے۔ اس سے الگ پیسے منگواتی ہے اور یارانے الگ لگا رکھے ہیں۔

پھر وہ سسرال گئیں۔ خاوند اُستانی کو الگ لے گیا اور انہیں یہی بتایا جو انہیں عورتیں پہلے ہی بتا چکی تھیں۔ اُستانی نے خاوند سے یہ گلہ کیا کہ اُس نے جھوٹ بولا اور اپنے آپ کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا ہے۔ اسے پہلے ہی بتا دیتا کہ یہاں یہ صورتِ حال ہے۔ خاوند نے اسے یقین دلایا کہ وہ پہلی بیوی کو طلاق دے رہا ہے لیکن اُستانی بگڑ گئی اور کہا کہ پھر طلاق دے کر اور ہمیں بتا کر شادی کرنی تھی۔

اس پر خاوند بھی بگڑ گیا۔ دونوں میں تلخ کلامی شروع ہوگئی۔ خاوند طعنوں پر اُتر آیا اور یہاں تک کہہ بیٹھا کہ ذرا اپنا گھر دیکھو، اپنی حیثیت دیکھو، ماں تمہاری لوگوں کے گھروں میں جھاڑو دیتی پھرتی تھی۔ تم خدا کا شکر ادا کرو کہ میں نے تمہیں عزت دی ہے۔ کبھی خواب میں بھی یہ زیور دیکھا تھا جو میں نے تمہیں پہنایا ہے۔ تم اصل پنچ ہو۔ باپ تمہارا تانگہ چلاتے چلاتے مرگیا اور تم اتنے بڑے گھر میں آکر زبان چلا رہی ہو —— اور پھر خاوند نے یہ کہا —— "میں نے تمہیں خریدا ہے۔ تم جیسی چار اور خرید سکتا ہوں۔"

اُستانی اس سے آگے کچھ سن نہ سکیں۔ انہوں نے سسرال کے زیور کی جو چیزیں پہن رکھی تھیں وہ اُتار کر وہیں پھینکیں، دیں اور ماں کو ساتھ لے کر گھر آگئیں۔ سسرال

کے باقی زیور اور کپڑے ایک سوٹ کیس میں ڈالے اور وہ بھی سسرال پھینک آئیں۔ جن دو کوٹھیوں میں ٹیوشن پڑھاتی تھیں وہ انہوں نے چھوڑ دی تھیں۔

اس واقعہ کے بعد وہاں گئیں اور ان سے مدد مانگی کہ اسے طلاق لے دیں۔ انہوں نے خاوند کو نوٹس دلوایا کہ فوراً طلاق دے دے ورنہ دھوکہ دہی اور اخراجات کا دعویٰ دائر کر دیا جائے گا۔ خاوند مجرم تھا۔ پہلی بیوی کو طلاق دیئے بغیر یا اس کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے طلاق لکھ کر بھیج دی۔

اُستانی نے ہمیں بتایا کہ تھوڑا عرصہ بعد پتہ چلا کہ اس آدمی کی پہلی بیوی واقعی آوارہ تھی۔ خاوند کے ساتھ ملک سے باہر نہیں جاتی تھی۔ اس سے الگ پیسے منگواتی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں سسرال میں نہیں بلکہ اپنے ماں باپ کے گھر رہتی تھی۔ اس نے فیشن کو زندگی بنا رکھا تھا اور وقت غیر مردوں کے ساتھ گزارتی تھی۔ خاوند اسے طلاق دینا چاہتا تھا لیکن وہ پولیس آفیسر کی بیٹی تھی۔ اس کے باپ نے داماد کو کہہ رکھا تھا کہ جس روز میری بیٹی کو طلاق دو گے اسی روز ڈکیتی میں گرفتار کر لوں گا۔

اب وہ باہر سے اس ارادے سے آیا تھا کہ اسے طلاق دے گا لیکن اسے پھر وہی دھمکی ملی۔ اب وہ بہت ساری رقم لے کر آیا تھا کہ مقدمے اور رشوت میں خرچ کر کے بیوی سے گلوخلاصی کرائے گا لیکن کسی کے غلط مشورے سے اس نے دولت پر بھروسہ کیا اور انتقاماً دوسری شادی کر لی۔ ادھر دوسری بیوی نے طلاق کا نوٹس دے دیا۔ ادھر پہلی بیوی نے دوسری شادی کے جرم میں استغاثہ دائر کر دیا۔ اور وہ چکی میں پسنے لگا۔

تو جو ہوا سو ہوا، اُستانی کی دنیا میں زلزلہ آگیا۔ اس کے ذہن میں خاوند کے یہی الفاظ ڈنک مارنے لگے — "میں نے تمہیں خریدا ہے.... اپنا گھر دیکھو۔ اپنی حیثیت دیکھو" — اس کے ساتھ اسے وہ امیرزادے یاد آنے لگے جو اسے کاروں اور کوٹھیوں کے خواب دکھاتے تھے۔ اسے ان سب سے نفرت ہوگئی۔ روپے پیسے سے نفرت ہوگئی۔ وہ بے چین رہنے لگیں۔

ماں نے کہا کہ بیٹی، ٹیوشنیں پھر سے شروع کر دو لیکن انہیں بڑے گھروں سے اور ان کی اُجرت سے اتنی نفرت ہوگئی کہ وہاں کی ٹیوشنیں دوبارہ شروع نہ کیں۔ گھر میں پیسے کی تو ضرورت ہی تھی۔ ایک روز وہ اس سکول کی ہیڈ مسٹریس کے پاس چلی گئیں جہاں ہم پڑھتی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس کو اپنی تمام بپتا سنائی اور بہت روئیں۔ ہیڈ مسٹریس نے انہیں رکھ لیا۔ یہ پرائیویٹ سکول تھا۔ مالک سے تنخواہ بھی معقول منظور کرا دی اور انہیں آٹھویں جماعت دے دی۔ اُس وقت ہم نئی نئی آٹھویں میں آئی تھیں۔

دینو نے ان کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھوڑا اور تانگہ بھی لے گیا تھا۔ اُستانی نے ماں سے دوسرے گھروں کا کام چھڑوا دیا اور وہ سکول آنے جانے لگیں۔ ایک بار پھر انہیں کاروں اور سکوٹروں کی نفشیں پیش کی جانے لگیں۔ ان کا ذہن اب ان چیزوں سے دُور چلا گیا تھا۔ اور وہ یہ بھی محسوس کرنے لگی تھیں کہ انہیں تکبّر کی سزا ملی ہے۔ انہوں نے دینو سے کہا تھا کہ اپنی شکل دیکھو، تم اَن پڑھ ہو۔ میں چاہوں تو کسی کار والے سے رشتہ جوڑ سکتی ہوں۔ تجھے تو میں اپنا نوکر بھی نہ رکھوں۔

ایک روز انہوں نے ماں کو بتائے بغیر دینو کی تلاش شروع کر دی۔ سکول سے

گھر تک پیدل گئیں اور کئی تانگے روک کر پوچھا کہ دینو تانگے والا کہیں مل سکتا ہے؟ ایک تانگے والے نے انہیں بتایا کہ دینو کو ڈھونڈنا ہے تو فلاں جگہ مل جائے گا۔ تانگے سے جو کما آتا ہے وہ چرس میں اُڑا دیتا ہے۔

اُستانی اسی تانگے میں بیٹھیں اور وہ انہیں اس جگہ لے گیا۔ وہاں دینو نہیں تھا۔ بڑی ہی بدبودار اور غلیظ جگہ تھی۔ وہاں جو دو آدمی بیٹھے تھے وہ ملنگ لگتے تھے۔ اُستانی نے انہیں کہا کہ دینو آئے تو اسے کہنا کہ حمیدہ آئی تھی۔ کہہ گئی ہے کہ رات کو گھر آنا۔ بہت ضروری کام ہے۔

رات کو دینو ان کے گھر آگیا۔ ماں اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔ اُستانی نے کہا کہ میں نے بلایا ہے۔ وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گئیں اور پوچھا — "دینو! تم بُری عادتیں چھوڑ سکتے ہو؟"

"تمہیں میری عادتوں سے کیا؟" دینو نے بے رُخی سے جواب دیا — "میرا تیرا کوئی رشتہ نہیں حمیدہ۔ تم نے میری بات نہیں مانی تھی، میں تمہاری نہیں مانوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیوں بلایا ہے؟"

"میرا تیرا بڑا گہرا رشتہ ہے دینو" اُستانی نے کہا — "میاں بیوی کا رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے"

دینو نے اسے گھبرا کر دیکھا۔ اُستانی نے کہا — "میں تمہارے ساتھ شادی کروں گی" — اور انہوں نے اسے ساری بات سُنا دی۔

دینو غنڈہ تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور قہر سے بولا — "میں پہلے اسے ٹھکانے لگاؤں جس نے تمہیں دھوکہ دیا ہے"۔

اُستانی نے اسے ٹھنڈا کر دیا اور کہا — "کوئی فائدہ نہیں۔"

دینو کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا — "میں تم سے زبردستی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں دل سے چاہتا تھا۔ اب ساری ساری رات ملنگوں میں بیٹھا چرس پی پی کر تمہیں بھلانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ پاپی تو میں پہلے ہی تھا۔ تم نے تو مجھے دنیا کا بھی نہ چھوڑا۔"

اور جب سکول میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہماری اُستانی نے ایک تانگے والے کے ساتھ شادی کر لی ہے تو سارے سکول میں سنّاٹا طاری ہو گیا تھا۔ ہائیں اتنی پیاری اُستانی نے یہ کیا کیا ہے اور، اُستانی کہتی ہیں کہ ان کے امیر کبیر اُمیدواروں نے یہاں تک مشہور کر دیا تھا کہ حمیدہ نے دھندا چلانے کے لیے تانگے والے کو خاوند بنایا ہے تا کہ کوئی شک نہ کرے۔

دینو نے بُری عادتوں سے توبہ تو کر لی لیکن جُوئے اور چرس کا نشہ چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اُستانی اور دینو کو ایک صبر آزما جنگ لڑنی پڑی۔ آخر اُستانی کے والہانہ پیار نے دینو کو جُوئے اور خصوصاً چرس سے نجات دلا دی۔ دینو تانگہ چلاتا رہا، اُستانی سکول پڑھاتی رہیں۔ تین برسوں میں کچھ رقم بچالی جو پیشگی دے کر ایک سیکنڈ ہینڈ ٹیکسی قسطوں پر لے لی۔

دینو کو ٹیکسی چلاتے ایک سال ہو گیا ہے۔ اُردو لکھ پڑھ سکتا ہے جو اُستانی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اُستانی مطمئن ہیں اور بہت ہی خوش۔

* *

مجھے گناہ گار کہہ لیں لیکن.....

یہ عرض کر دے گا کہ کسی عورت کو اولاد پیدا نہ کر سکنے کے جرم میں طلاق دینے سے پہلے میری کہانی ضرور پڑھ لیں۔

ارشاد احمد

عرصہ دس سال سے سوچ رہا تھا کہ اپنی کہانی کسی کو سناؤں لیکن ہمت اس واسطے نہ ہوئی کہ لوگ اپنی جو آپ بیتیاں سنایا کرتے ہیں ان میں ان کی بہادری کے واقعات ہوتے ہیں یا ایسی آپ بیتیاں جن میں مصائب اور ان کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے مگر میری آپ بیتی میں نہ بہادری ہے نہ جدّوجہد۔ یہ گناہوں کی کہانی ہے۔ میں دس سال سوچتا رہا مگر ہمت نہ ہوئی۔ حوصلہ کر کے پوری بات سنا رہا ہوں۔ مجھے توقع ہی ہے کہ میری آپ بیتی پڑھ کر آپ مجھ گناہگار پر لعنت بھیجیں گے لیکن میں آپ سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ مجھ پر لعنت بھیج کر اپنے معاشرے، اپنے محلے اور اپنے گھر میں نظر دوڑا لینا۔ ہو سکتا ہے آپ کا پڑوسی یا آپ خود بیوی کو اس جرم میں طلاق دینے کی سوچ رہے ہوں کہ اس سے اولاد نہیں ہوتی۔

میں ہندوستان کے ایک قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ میرے چھوٹے سے کنبے پر موت ذرا زیادہ ہی مہربان تھی۔ سنا تھا کہ مجھ سے پہلے میری ایک بہن پیدا ہوئی تھی جو دو سال کی عمر میں مر گئی تھی۔ پھر میں پیدا ہوا۔ شاید میں ایک سال کا تھا جب میرا باپ مر گیا

اور جب میں آٹھ سال کا ہوا تو ماں بھی مر گئی۔ وہ وقت جب ماں کی آنکھیں پتھرائیں اور وہ وقت جب ماں کا جنازہ گھر سے نکلا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اگر میں ایک ہزار سال زندہ رہا تو بھی یہ دونوں وقت میری آنکھوں کے سامنے اسی طرح تازہ رہیں گے جیسے یہ آج صبح کے واقعات ہوں۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ یہ بھی بیان کروں کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی تھی۔ اس حالت کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی ماں کو لوگ اس وقت دفن کر آئے ہوں جب وہ آٹھ سال کا بچہ تھا۔ دوسرا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔

میرے لیے شفقت نہ رہی، پیار نہ رہا، گھر نہ رہا۔ ماں زندہ تھی تو باپ کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ ماں بھی نہ رہی تو باپ کی یاد نے تڑپا دیا۔ یہ دونوں بزرگ میرا بچپن بھی اپنی قبروں میں لے گئے اور میں خاندان کے لیے متنازعہ چیز بن گیا۔ نانا مجھے اپنے گھر رکھنا چاہتا تھا اور میرا چچا مجھے اپنے ہاں لے جانا چاہتا تھا۔ یہ جھگڑا محلے کے بڑوں کے سامنے پیش ہوا۔ مقدمہ بازی تک نوبت آ چلی تھی۔ ان لوگوں کی آپس میں بہت تو تو میں میں ہوئی تھی۔ دھمکیوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔

آخر میرا چچا جیت گیا اور مجھے اپنے گھر رکھ لیا۔ میں نانی کے پاس رہنا چاہتا تھا مگر چچی نے سختی سے روک دیا تھا۔ پھر بھی میں چوری چوری نانی کے پاس چلا جاتا تھا۔ ایک روز پکڑا گیا تو چچا نے میرے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ یہ میری زندگی کا پہلا تھپڑ تھا۔ میں بہت رویا مگر مجھے ماں کی طرح کسی نے پیار سے چپ نہ کرایا۔ اور میں خود ہی چپ ہو گیا۔

چچا کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا لڑکا دسویں جماعت میں پڑھتا تھا

اور چھوٹا چھٹی جماعت میں۔ ان سے بڑی ایک بہن تھی اور ایک سب سے چھوٹی۔ میں تیسری جماعت میں تھا۔ چچا آڑھتی تھا۔ اُس نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور نہ اسے تعلیم کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ تعلیم کی طرف لوگ توجہ نہیں دیتے تھے۔ چچا اپنے لڑکوں کو اپنے کاروبار میں لگانے کے لیے دس دس جماعتیں پڑھانا چاہتا تھا۔ لڑکیوں کو پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

وہ مجھے جس استعمال میں لانا چاہتا تھا وہ میں تیسری جماعت میں ہی سمجھ گیا تھا۔ میرا استعمال یہ تھا کہ جسے غصہ آئے وہ مجھ پر نکال لے سکول سے گھر آؤں تو چچی کا سر دباؤں۔ شام کو چچا کو دکان سے دیر سے آنا ہو تو اس کے لیے کھانا دکان پر لے جاؤں۔ چچا کے بڑے لڑکوں کی نوکری کروں۔ چُپ رہوں، ہنسوں نہیں، روؤں نہیں۔ کچھ مانگوں نہیں۔

میں جُوں جُوں بڑا ہوتا گیا، گھر کا نوکر بنتا گیا۔ بڑا ہو کر میں ذرا دلیر بھی ہو گیا۔ دلیری یہ تھی کہ میں نانی کے پاس چلا جاتا تھا۔ وہ مجھے دودھ پلاتی۔ پیسہ دو پیسے دے دیتی۔ پیار کرتی، مجھ سے پُوچھتی کہ میرے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوتا ہے۔ میں اسے بتاتا اور روتا۔ اور کبھی میں ماں کی قبر پر چلا جاتا تو اتنا روتا کہ اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ روتے دھوتے، چچا کے گھر مار کھاتے اور اس گھر کی نوکری کرتے پانچ سال گزر گئے اور میری نانی مر گئی۔ اس کا اتنا ہی صدمہ ہُوا جتنا ماں کے مرنے کا ہُوا تھا۔ نانا بے چارے کو فالج نے زندہ درگور کر رکھا تھا۔ چچا کا بڑا لڑکا اب باپ کی آڑھت کا منشی تھا۔ چھوٹے نے بھی میٹرک کا سرٹیفکیٹ لے لیا تھا اور باپ کی دکان پر جاتا تھا۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔

میں بھوکا اور ننگا رہ سکتا تھا، سردیوں کی راتیں چھت پر سونے کے لیے بھی تیار تھا لیکن میں پیار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ ایسی پیاس تھی جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ کوئی پیار کا ہلکا سا اشارہ بھی کرتا تو میں اس کا غلام ہو جاتا تھا مگر ایسے اشارے مجھے بہت کم ملتے تھے۔ گھر میں میرے لیے مار پٹائی، ڈانٹ ڈپٹ اور پھٹکار تھی۔ اسی میں عمر گزرتی جا رہی تھی۔

پھر چچا کے بڑے لڑکے کی شادی ہو گئی۔ اسے مکان کی اُوپر والی منزل دے دی گئی۔ اس کی بیوی خوبصورت تھی۔ میں اُس وقت لوگوں کی دھوکا بازیاں اور دوسری بہت سی حرکتیں سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرے چچازاد کو جو لڑکی دی گئی ہے اس کے والدین میرے چچا کی طرح امیر کبیر نہیں ہیں اور انہوں نے بڑی مشکلوں سے یہ رشتہ طے کرایا تھا۔ لڑکی عام قسم کی گھریلو لڑکیوں کی طرح تھی۔ اس میں کوئی شوخی نہیں تھی۔ ضرورت ہوتی تو بولتی ورنہ کام سے کام رکھتی۔ وہ اس گھر میں آکر اطمینان سے رہنے لگی۔

وہ ہر کسی کے آگے جُھکی جُھکی رہتی تھی۔ خدمت کرتی تھی اور یہ پیار حاصل کرنے کا طریقہ تھا۔ میری طرح وہ بھی شفقت کی پیاسی تھی، بلکہ میں کہوں گا کہ مجھ سے زیادہ مظلوم تھی۔ اس کی ماں اس کے بچپن میں مر گئی تھی۔ اس پر ظلم یہ ہوا کہ دو تین سال بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے اس پر جو ظلم کیے وہ کوئی مرد بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پانچ چھ سال کی عمر میں اس نے گھر کے برتن دھونا، جھاڑو دینا اور وہ سارے ہی کام شروع کر دیئے تھے جو عورت کیا کرتی ہے۔ وہ نور کے تڑکے اُٹھتی اور رات اُس وقت لیٹتی جب سبھی سو جاتے تھے۔ اس مشقت کے دوران سوتیلی

ماں اسے ماں بہن کی گالیاں دیتی اور مارتی بھی۔

پھر سوتیلی ماں کے بچے پیدا ہوئے تو یہ لڑکی اپنے سگے باپ کی بھی بیٹی نہ رہی نوکرانی بن گئی اور محلے والے بھی اسے اس گھر کی نوکرانی سمجھنے لگے۔ اسی شفقت اور مظالم میں وہ جوان ہوئی۔ ادھر میں بھی شفقت اور مظالم میں جوان ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے بڑی تھی۔ مجھے وہ اچھی طرح جانتی تھی اور چچا کے گھر میں میرے ساتھ جو سلوک شروع سے ہی ہو رہا تھا وہ بھی اسے معلوم تھا۔ وہ میرے زخموں سے واقف تھی۔ میرے زخم اس سے ملتے جلتے تھے۔ اس لیے وہ بیاہی ہوئی میرے چچا کے گھر میں آئی تو اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک شروع کر دیا۔ اس گھر میں یہ پہلا فرد تھا جس نے مجھے انسان سمجھا۔

کبھی کبھی میں اوپر اس کے کمرے میں چلا جاتا تو وہ مجھے دو چار پیسے بھی دے دیتی اور کھانے کے لیے بھی کچھ دے دیتی۔ وہ دراصل اپنی ماں کو یاد کرنا چاہتی تھی لیکن بات میری ماں کی کرتی تھی۔ مثلاً اس طرح — "اب تو اپنی ماں کو تم بھول گئے ہو گے؟ بڑے ہو گئے ہو نا؟"

میں ماں کی باتیں کرنے لگتا تو وہ اپنی ماں کو یاد کرنے لگتی لیکن اسے اپنی ماں کی شکل وصورت یاد نہیں تھی۔ پھر دن گزرتے گئے اور ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے دکھ سنانے لگے۔ وہ سوتیلی ماں کا ظلم اور تشدد سناتی اور میں چچا کے گھر کے مظالم کے قصے سناتا۔

میری چچی تھوڑے ہی دنوں بعد اسی قسم کی ساس بن گئی جس قسم کی ہمارے گھروں میں پائی جاتی ہیں۔ پہلے پہل اس نے بے رخی اختیار کی پھر آہستہ آہستہ

طعنے دینے شروع کیے اور بعد میں اسے یہاں تک کہنے لگی کہ اپنے گھر میں تیری اصلیت نوکرانی سے زیادہ نہیں تھی، یہاں آ کر شہزادی بن گئی ہے۔ لڑکی حیران تھی کہ اس کا قصور کیا ہے۔ وہ گھر میں پہلے سے زیادہ غلاموں کی طرح رہنے لگی لیکن ساس کی بدزبانی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے اپنے خاوند اور بیٹے کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور اس کی جو بیٹی شادی شدہ تھی اسے بھی اس کے خلاف کر دیا۔

میں خود حیران تھا کہ لڑکی کا قصور کیا ہے۔ اس سوال کا جواب مجھے ذرا اور بڑے ہو کر ملا۔ مجھے پتہ چلا کہ ساسوں کا سلوک ہر گھر میں یہی ہوتا ہے اور ہر گھر میں بہو کا قصور صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ بیاہی ہوئی اس گھر میں آ گئی ہے۔ جب یہ بہوئیں بوڑھی ہو کر ساسیں بنتی ہیں تو بہوؤں سے اپنی ساسوں کا انتقام لیتی ہیں اور اس طرح چار دیواری کی دنیا میدانِ جنگ بنی رہتی ہے۔ جھوٹ بولے جاتے ہیں، طلاقیں ہوتی ہیں یا بہوئیں دلوں پہ پتھر رکھ کر جوانی گزارتی رہتی ہیں اور جب ان کی بہوئیں آتی ہیں تو وہ ان پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

میرے چچا کے گھر جو ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا وہ عجیب نہیں تھا۔ اس ڈرامے کا نتیجہ یہ تھا کہ میرے چچازاد کے دل میں اپنی بیوی کی حیثیت زرخرید لونڈی کی سی رہ گئی۔ میں تو زرخرید غلام تھا ہی۔ مجھے اب اوپر کی منزل کے کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ میں اس لڑکی کا ہر کام دلی خوشی سے کیا کرتا تھا کیونکہ وہ میری غمخوار اور ہمدرد تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس گھر میں میرا درد صرف اسی لڑکی کے دل میں تھا۔ اور جب ساس نے اس کے لیے بھی یہ گھر جہنم بنا دیا تو اس کا ہمدرد میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ کئی بار وہ میرے ساتھ باتیں کرتی کرتی رو پڑی۔ یہ تو وہ اکثر کہا

ہوئی تھی کہ میں اپنی ساس کو ماں بنانا چاہتی تھی مگر وہ معلوم نہیں کیوں میری دشمن ہو گئی ہے۔

یہ لڑکی اس گھر میں آئی تو میرے لیے تھوڑا سا سکون پیدا ہو گیا۔ دل زیادہ اُداس ہوتا تھا تو میں اُوپر جا کر اس کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ دل کی سُناتا اور اس کے دل کی سُنتا تھا۔ ہم مل کے آنسو بہاتے اور ایک دوسرے کو بہلاتے تھے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میں نے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کر لیا۔ اس سے میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ سوائے اس کے کہ اب میں سکول جانے کی بجائے دُکان پر جانے لگا۔ وہاں بھی میں نوکر تھا۔ اناج تولنا، باردانا اکٹھا کرنا، اُٹھانا سنبھالنا اور بھاگنا دوڑنا میرے ذمّے تھا۔ گھر ضرورت پڑتی تو مجھے وہاں بلا لیا جاتا اور ایک دن حکم ملا کہ سارے گھر کی سفیدی کر دو۔ میں نے وہ بھی کر دی۔ میں پُورے چودہ روز صبح سے شام تک سفیدی کرتا رہا۔

چھوٹے موٹے واقعات سُنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں جو آپ نے نہ سُنا ہو یا اپنی آنکھوں نہ دیکھا ہو۔ میں آپ کو بہت بڑا واقعہ سُناتا ہوں۔

میری عمر بیس سال ہو چکی تھی۔ میرے چچا زاد بھائی کی شادی ہوئے چھ سال گزر گئے تھے لیکن اولاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ خاندان پسماندہ تھا۔ ایسی باتوں کو شرک سمجھتا تھا کہ خاوند اور بیوی کا ڈاکٹری معائنہ کرایا جائے۔ وہاں ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ چلتے تھے۔ لڑکی کو خانقاہوں پر لے جایا جانے لگا۔ اس کے گلے میں تعویذ ڈالے گئے۔ تعویذ پانی میں گھول کر بھی پلائے گئے۔ گھر میں عامل بلائے گئے تاکہ وہ سراغ

لگا کر بتائیں کہ کسی نے دشمنی سے گھر میں تعویذ تو نہیں دبا دیئے؟ یا کسی نے کالا جادُو تو نہیں کر دیا؟

عامل اپنے تعویذ گھر کی دیواروں میں رکھ کر اور پیسے کھرے کر کے چلے گئے۔ پھر جس کسی نے کسی بھی خانقاہ کا، کسی پیر فقیر یا کسی عامل کا نام لیا، لڑکی کو وہاں لے جایا گیا مگر اس کی گود ہری ہونے کے آثار نظر نہ آئے۔

دو سال اور گزر گئے۔ ساس نے اپنی بہو کو طعنے دینے شروع کر دیئے اور اسے منحوس کہنے لگی۔ گھر میں اب اس کے ساتھ کوئی بات بھی نہیں کرتا تھا۔ خاوند بھی اس سے دُور ہٹنے لگا۔ یہی آدمی اس کا آخری سہارا تھا، وہ بھی نہ رہا۔ ساس کو ایک اور سہارا مل گیا۔ یہ ایک نیا فقیر تھا جس نے ہمارے قصبے کے قریب آ ڈیرہ جمایا تھا۔ وہ کوئی مجذوب تھا۔ مسلمان اس قدر توہم پرست لوگ ہیں کہ سُنی سنائی پر یقین کر لیتے ہیں اور دیکھا دیکھی بیوقوف بن جاتے ہیں۔ یہ فقیر نیم برہنہ رہتا تھا۔ مشہور ہو گیا کہ بے اولادوں کو اولاد دیتا ہے۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ لال سُرخ تھا۔ بال بکھیرے رکھتا تھا اور اس پر وجد طاری رہتا تھا۔ اولاد کے حاجتمند اس کے کچے سے مکان میں جمع رہتے تھے۔ میری چچی اپنی بہو کو (جسے میں اب بھابی کہوں گا کیونکہ اصل نام بتانا مناسب نہیں) اس فقیر کے پاس لے گئی۔

واپس آئی تو اس سے ملنے کا موقعہ مل گیا۔ وہ اس فقیر سے مطمئن اور متاثر نظر آتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے اسے کہا ہے کہ جب شام کا سورج اندر باہر ہو تو اس کے پاس اکیلی آئے۔ دوسرے روز وہ شام کے وقت اکیلی چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ دوسرے دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس فقیر کے پاس نہیں

جائے گی۔ اس نے وجہ نہیں بتائی۔ شام کے وقت ساس نے اسے فقیر کے پاس جانے کو کہا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگی۔ ساس اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ جب دونوں واپس آئیں تو ساس نے اسے بہت گالیاں دیں۔ بھابی روتی رہی اور گالیاں سُنتی رہی۔ وہ بولی تو صرف اتنا کہا۔ "میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

وہ نہیں گئی۔ اس کا یہی قصور بہت سنگین تھا کہ اس نے آٹھ سالوں میں ایک بھی بچّہ نہیں جنا تھا۔ اِس پر یہ گُناہ کہ اس نے اس فقیر کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے سُسرال نے سزا سُنا دی ـــــ طلاق!

بے آسرا عورت کے لیے طلاق بڑا ہی خوفناک لفظ ہے۔ بھابھی کے لیے تو اور زیادہ خوفناک تھا۔ اسے سوتیلی ماں سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ خاوند سے پیار بھی مل گیا تھا۔ اب وہ پیار بھی چھن چکا تھا اور اسے سوتیلی ماں کے پاس واپس جانا تھا۔ اب تو سوتیلی ماں اس کی چمڑی بھی اُدھیڑ لیتی۔ اُس گھر میں جو اس کے ماں باپ کا گھر تھا، کوئی جگہ نہیں تھی۔ اسے جب خاوند نے کہا کہ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کرے گا تو اس پر غشی طاری ہو گئی۔ دُنیا اندھیر ہو گئی۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر خاوند کی دوسری شادی کا فیصلہ تو قبول کر لیا لیکن اس نے اسے کہا کہ اُسے طلاق نہ دی جائے۔ وہ خاوند کے پاؤں میں گر ی۔ اس کے پاؤں پر سر رگڑا۔ ساس اور سسر کے پاؤں چُومے مگر اس پر کسی کو رحم نہ آیا۔

مجھے وہ منظر نہیں بھُولیں گے جب وہ ان تینوں بے رحم انسانوں کے پاؤں چُوم رہی تھی اور وہ اسے فرعونوں کی طرح دھتکار رہے تھے۔ بھابھی کی کمزوری اور مجبوری یہ تھی کہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ماں تو سوتیلی تھی، باپ بھی اسے بھُول چکا تھا۔

اِس رات اُس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اس فقیر کے پاس جائے گی اور وہ جو تعویذ یا ٹونہ ٹوٹکا بتائے گا کرے گی لیکن اکیلی جاتے ڈرتی ہے۔ صبح خاوند نے اپنی ماں کو بتایا تو ماں نے کہا کہ وہ فقیر یہاں سے جا چکا ہے اور اب تین میل دُور ایک گاؤں میں ہے۔ اس فتنہ پرداز عورت نے اس فقیر کی ٹوہ لگا رکھی تھی۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ بھابھی کو اس فقیر کے پاس لے جاؤں۔

تین میل فاصلہ کوئی ایسا زیادہ نہیں تھا۔ مجھے جو گاؤں بتایا گیا تھا وہاں تک کچی پگڈنڈی جاتی تھی۔ کوئی تانگہ نہیں جاتا تھا۔ میں بھابھی کو ساتھ لے کے چل پڑا۔ میں بہت خوش تھا کہ راستے میں بھابھی کے ساتھ دُکھ سُکھ کی باتیں ہوں گی اور اس گھر سے دُور ہم اپنے دُکھوں کو بھُول جائیں گے۔

ہم قصبے سے نکل گئے۔ ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ گھٹائیں گھر کر آگئیں اور گرجنے لگیں۔ فوراً ہی موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دُور ہمیں درخت نظر آئے جن کے درمیان ایک کچّی کوٹھڑی تھی۔ دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ کھیت اور درخت تھے اور آگے علاقہ بنجر تھا۔ فصل خاصے اُونچے تھے۔ ہم دوڑ کر کوٹھڑی تک پہنچ گئے۔ دروازہ کھُلا تھا۔ باہر کچی کچی کھُرلیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کوٹھڑی اور یہ کھُرلیاں کسانوں نے بنائی ہوئی تھیں جنہیں وہ ہل چلانے کے یا بیجائی کے دنوں میں دوپہر کے وقت تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اُن دنوں فصل پکنے والے تھے اس لیے کوٹھڑی خالی تھی اور ارد گرد کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم کوٹھڑی میں چلے گئے۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ بارش تھمنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ بھابھی رو پڑی۔ مجھے اُس وقت معلوم نہیں تھا کہ پیر فقیر جھُوٹے اور دھوکہ باز

بھی ہوتے ہیں۔ میں نے بھابھی کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ تم پہنچ والے فقیر کے پاس جا رہی ہو۔ اُمید ہے اللہ اُس کی دُعا ضرور قبول کرے گا گھبراؤ نہیں۔

اُس نے اس طرح سر جھٹک کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے اسے بے خبری میں سُوئی چبھو دی ہو۔ اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں کچھ بھی نہیں بولا۔ اس نے آنکھیں نیچے کر لیں۔ ذرا دیر بعد اُس نے آنکھیں اُٹھائیں اور کہا — "تم جانتے ہو کہ میرے دُکھ سُننے والا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے ٹھیک ہے ناں؟"

میں نے جواب دیا — "تم بالکل ٹھیک کہتی ہو..... کیوں؟ کیا بات ہے؟ تم نے یہ بات کیوں پوچھی ہے؟"

"ایک بات کہوں، بُرا تو نہیں مناؤ گے؟" اس نے کہا — "قسم کھاؤ کہ میری بات تمہیں کتنی ہی بُری کیوں نہ لگے تم خفا نہیں ہو گے۔"

میں نے اللہ پاک کی قسم کھا کر کہا — "تم بات کرو۔ میں بُرا منا کر کسی کا کیا بگاڑ لوں گا۔"

اُس نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہا — "اس فقیر کی دُعا مجھے بچہ نہیں دے سکتی مگر میں اس سے بچہ لینے جا رہی ہوں" — میں اس کی بات سمجھ نہ سکا۔ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا — "تم نہیں سمجھے۔ یہی وہ بُری بات ہے جو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں۔ میں اس فقیر کے پاس ساس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ اکیلی آئے ورنہ میرا عمل بے اثر رہے گا اور اسے بچہ نہیں ہو گا۔ میں اکیلی گئی تو یہ فقیر مجھے اصلی روپ میں نظر آیا۔ وہ فقیر نہیں شیطان ہے۔ میں بچے

کی خاطر اسے اپنی عزت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ پھر مجھے ڈرایا کہ تمہیں طلاق دلا دوں گا اور سب کو بتا دوں گا کہ تم کسی بزرگ کی بددُعائی ہوئی ہو۔ پھر تمہارے ساتھ کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔ میں پھر بھی اس کے دھوکے میں نہ آئی۔ اس کی باتیں اور حرکتیں بدمعاشوں کی طرح تھیں۔ وہ نشے میں تھا۔ آخر تنگ آ کر میرے ساتھ زبردستی کرنے لگا تو میں بھاگ آئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس فقیر کے پاس جانے سے انکار کر دیا تھا۔"

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ میں بچہ تو نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس بدمعاش فقیر سے بچہ لینے جا رہی ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ ایک مظلوم اور وفادار لڑکی جسے اپنی عزت عزیز تھی اور میں نے ماں کے بعد جسے اپنا غمخوار سمجھا تھا وہی لڑکی ہے تو مجھے ایسا صدمہ ہوا جیسے میری ماں دنیا میں واپس آ گئی اور پھر مر گئی ہے۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ میں نے اسے کہا — "میں نے قسم کھائی تھی کہ تمہاری بات کتنی ہی بُری کیوں نہ ہو، بُرا نہیں سمجھوں گا۔ لیکن تمہاری بات سُن کر میرا دل کانپ گیا ہے۔"

"تمہارے دل کی کسے پرواہ ہے؟" اس نے کہا۔ "اور میرے دل کی کسے پرواہ ہے؟ انہیں بچہ چاہیے یا دوسری بیوی۔ انہوں نے میرا جو حال کر دیا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ ساس نے مجھے محلے کی عورتوں میں بیٹھ کر کہا کہ یہ کسی پیر کی بددُعائی ہوئی ہے اور اس کی کوکھ ہمیشہ خشک رہے گی مگر میں اپنی شرم اور ان کی عزت کی خاطر یہ نہ کہہ سکی کہ ذرا اپنے بیٹے کو تو دیکھو کہ وہ کس کا بددُعایا ہوا ہے

کیا کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ نقص میرے خاوند میں بھی ہو سکتا ہے؟ ایک رات میں نے اسے کہا کہ آپ اپنا علاج معالجہ کرا کے دیکھ لیں۔ یہ سن کر وہ غصے سے لال بیلا ہو گیا اور کہنے لگا کہ تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔ مجھ میں کوئی نقص نہیں۔ پھر میں نے اس کے پاؤں، اس کے باپ کے پاؤں اور اس کی ماں کے پاؤں میں سر رکھا۔ میں روئی، میں نے ہاتھ جوڑے اور سسک سسک کر کہا، ظالمو مجھے زندہ دفن کر دو، طلاق نہ دو۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں لیکن انہوں نے گردنیں اور اونچی کر لیں۔ اگر میرا کوئی باپ یا بھائی ہوتا تو میں اس خاوند کی مردانگی پر تھوک کر اپنے باپ اور بھائی کے پاس چلی جاتی۔ مگر کہاں جاؤں؟ اگر سوتیلی ماں کے پاس چلی بھی جاؤں تو میرے ساتھ کوئی دوسرا آدمی شادی نہیں کرے گا۔ میری ساس نے سارے محلے اور برادری میں مشہور کر دیا ہے کہ یہ لڑکی بددعائی ہوئی ہے اور اس پر کالا سایہ ہے۔"

وہ بول رہی تھی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا جا رہا تھا کہ یہ چُپ چاپ، مری ہوئی لڑکی جو ساس، سسر اور خاوند کے آگے زرخرید لونڈیوں کی طرح بچھی رہتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں دل نہیں نہ جسم میں جان ہے، وہ دانت پیس پیس کر باتیں کر رہی تھی۔ کبھی تو مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ وہ لڑکی نہیں کوئی اور ہے۔ اس کے اندر ماں کے مرنے کے بعد سے جو غبار رُکا ہوا تھا وہ آگ کے شعلے بن کر نکل رہا تھا۔ چار دیواری کے قید خانے کے قیدی نے دیوار توڑ لی تھی۔ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ ذلت میں غوطہ لگاؤ، کچھ کرو، بچہ پیدا کرو ورنہ طلاق لے کر ساری عمر روتی اور تڑپتی رہو۔

یہ سزا بڑی ہی سخت تھی اور یہ سزا ایسے جُرم کی تھی جس کی مجرم یہ لڑکی نہیں تھی۔ اسے اتنا زیادہ مجبور کر دیا گیا کہ اس نے نجات کا راستہ ڈھونڈ لیا مگر اتنے بڑے گناہ کا بوجھ اس کے معصوم اور مجبور ضمیر کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اسی لیے اس نے مجھے رازدار بنانا چاہا تھا۔

میں سر جُھکا کر سوچوں میں غرق ہو گیا۔ ظلم مجھ پر بھی ہوئے تھے لیکن میں مرد تھا اس لیے سہہ لیے۔ وہ لڑکی تھی۔ وہ نہیں سہہ سکی۔ اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی وہاں انسان انسان نہیں رہتے، حیوان بن جاتے ہیں۔ اس لڑکی کو بھی حیوان سمجھا گیا اور شادی ہوئی تو اسے یہ سمجھایا گیا کہ عورت کا کام ہے خدمت کرنا اور بچے پیدا کرنا ورنہ اسے بیکار مویشی کی طرح ذبح کر دیا جائے گا۔ میری بھابھی بالکل گنوار اور اُجڈ تھی۔ مذہب کے صرف نام سے واقف تھی۔ اس کے اردگرد شرافت اور حیا کی ایک دیوار تھی جسے اس کی سوتیلی ماں اور سسرال کی چوٹوں نے توڑ دیا۔

بارش بہت تیز برس رہی تھی۔ ہم اکیلے تھے۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر سر اُوپر کیا۔ وہ میرے قریب آ گئی۔ کہنے لگی "تم میں اتنی ہمت ہے کہ میں طلاق لے لوں تو تم میرے ساتھ شادی کر لو؟..... نہیں۔ تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تم ان کے محتاج ہو..... سچ بتاؤ، تمہیں میرا ارادہ بُرا لگا ہے"۔

"بہت بُرا" میں نے کہا۔ "تم ایک بدمعاش کے بچے کی ماں بنو گی؟"

ہم بہت دیر چُپ رہے۔ اس نے اچانک اُٹھ کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ یہ تو میں پہلے ہی دیکھ رہا تھا کہ یہ لڑکی بالکل بدل گئی ہے مگر کوٹھڑی

کا دروازہ بند کر کے اس میں جو تبدیلی آئی اس نے مجھے بھی باؤلا کر دیا۔ میرے کان میں اس کے یہ الفاظ پڑے ۔ "تم تو بدمعاش نہیں ہو۔ میرے اچھے بُرے کے ساتھی صرف تم ہو۔"

پھر ایسے لگا جیسے مَیں بے ہوش ہو گیا تھا۔

بارش کچھ دیر بعد تھمی۔ مَیں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرا سر جُھکا ہوا تھا۔ زبان بند تھی۔ اس نے کہا ۔ "تم ڈر گئے ہو۔ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔"

ہم جب گھر میں داخل ہُوئے تو شام کا اندھیرا کالا ہو گیا تھا۔ کیچڑ سے ہم لتھڑ گئے تھے۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر ساس سے جھوٹ بولا ۔ "ہم بارش سے پہلے فقیر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ وہاں سے بھی جا رہا تھا لیکن بارش نے اسے روک لیا۔ ہماری قسمت، اچھی تھی کہ وہ ہمیں مِل گیا۔ اس نے کوئی عمل کر کے کہا ہے کہ اللہ مراد پوری کرے گا۔"

ساس کی باچھیں کِھل گئیں۔ اس کے بعد مَیں بھابھی کے کمرے میں جاتا رہا۔ اور ساس کی مُراد پوری ہو گئی۔ بچّی پیدا ہوئی۔

ساس اس فقیر کو ڈھونڈتی تھی مگر وہ سنری فقیر تھا، نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ جن خانقاہوں پر نذرانے مانے گئے تھے وہ دیے گئے اور جن عاملوں اور بزرگوں کے تعویذ استعمال ہوئے تھے انہیں بھی کپڑے اور پیسے دیئے گئے اور گھر میں خوشیاں منائی گئیں۔ میرے دل کی حالت بہت بُری تھی۔ ایک تو یہ خوشی تھی کہ ایک عورت خاوند کے جیتے جی بیوہ ہونے اور سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے بچ گئی تھی اور اس گناہ کا بوجھ تھا جو مجھے بہت پریشان رکھتا تھا اور تیسری پریشانی یہ تھی کہ مَیں اپنی

بچّی کو اپنا خون نہیں کہہ سکتا تھا۔

چار مہینے گزرے تو ایسا انقلاب آیا کہ نیکی اور بدی کی کوئی تمیز نہ رہی آسمان زمین پہ آ پڑا اور مسلمان خون میں ڈوب گئے۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کا قتلِ عام تھا۔ ہمارا قصبہ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادیوں میں گھرا ہُوا تھا۔ قصبے کی زیادہ تر آبادی انہی کافروں کی تھی۔ مسلمانوں کے اکّے دُکّے قتل کی وارداتیں بہت دنوں سے سُننے میں آ رہی تھیں۔ مسلمان بہت خوفزدہ تھے۔ ہندو دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ گھر والوں نے مجھے یہ خطرناک ڈیوٹی دے رکھی تھی کہ مَیں رات کو دکان میں سویا کروں اور گودام کی چوکیداری کروں۔ میرے پاس ایک کلہاڑی ہوتی تھی۔

ایک رات قصبے پر حملہ ہو گیا۔ دیہات کے سکھ بھی آ گئے تھے مَیں اُس رات کا بیان کن الفاظ میں کروں۔ قصبے میں گولیوں کے دھماکے تھے، عورتوں اور بچّوں کی چیخیں تھیں۔ مکان جل رہے تھے۔ مَیں نے دکان اندر سے بند کر لی تھی اور اندر ہی چُھپ گیا تھا۔ باہر بازار میں لوگ اس طرح دوڑ رہے تھے جیسے گھوڑے بھاگ دوڑ رہے ہوں۔ مجھے طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ مقتول کی آخری آواز ہے اور یہ قاتلوں کی بھاگ دوڑ ہے۔ مجھے اپنی جان کے سوا کسی کا غم نہیں تھا۔ مَیں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہیں چُھپا رہوں یا بھاگ جاؤں۔ ہر جگہ موت ہی موت تھی۔

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ قتل و غارت اور لوٹ مار بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو میرا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ ہماری دکان اور گودام میں اناج اور دالوں کی بوریوں کے ڈھیر چھت تک لگے ہوئے تھے۔ قصبے میں سب کو معلوم تھا کہ یہ

مسلمان کی آڑھت ہے اس لیے یہاں ہندوؤں اور سکھوں کا آنا ضروری ہے۔ اس خوف سے میرا خون خشک ہوگیا۔ اندر گرمی اور حبس بہت زیادہ تھا۔ میں پسینے میں نہا رہا تھا اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ میرے چچا، چچی اور ان کی اولاد کو میرا کوئی فکر نہیں۔ انہوں نے مجھے رکھوالی کا کتا سمجھ کر یہاں بند کر دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ چلو اسی بہانے اس ذلیل زندگی سے نجات مل جائے گی۔ کوئی ہندو یا سکھ آئے اور مجھے قتل کر دے۔ اس سے میرا خوف دور ہوگیا اور اچانک اپنی ماں یاد آگئی۔ اس یاد سے مجھے خوشی ہوئی کہ میں اپنی ماں کے پاس جا رہا ہوں۔ میں جوانی کی عمر میں بچہ بن گیا۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ زندگی کی آخری گھڑیاں تھیں۔ سکون حاصل کرنے کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ موت کو قبول کر لو۔ اسی ارادے سے میں نے اپنے دل سے کہا کہ تم ہنسی خوشی مر جاؤ، تمہارے پیچھے رونے والا کوئی نہیں۔

ایک عجیب بات ہوئی کہ میرے ذہن میں اچانک بھابھی کی بچی آگئی جو اصل میں میری بچی تھی۔ میرا دل جل اٹھا اور میرے جسم میں اچانک طاقت آگئی۔ میرے دل نے کہا کہ تیرا اپنا خون اس دنیا میں موجود ہے۔ میرے اندر پیار کا طوفان اٹھا اور یہ ایک طاقت بن گیا۔ یہی ایک بچی تھی جسے میں اپنا کہہ سکتا تھا۔ وہ تھی تو میرے گناہ کی پیداوار لیکن میرے پیار کی نشانی تھی۔ میرے لیے اس دنیا میں پیار رہا ہی کہاں تھا۔

خون نے خون کو اتنی زور سے کھینچا کہ میں نے دکان کا دروازہ کھولا اور کلہاڑی ہاتھ میں اٹھائے باہر آگیا۔ میں بچی کو بچانے کا پختہ ارادہ کرکے گھر کی

طرف دوڑ پڑا۔ میں نے بالکل نہیں سوچا کہ گھر میں آدمی موجود ہیں، انہوں نے عورتوں کو بچا لیا ہوگا یا وہ بھاگ گئے ہوں گے یا مارے گئے ہوں گے یا مارے جا رہے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ابھی کافر اس گھر میں موجود ہوں اور مجھے بھی مار ڈالیں گے۔ میں نے کچھ نہیں سوچا۔ میرے دماغ اور دل میں صرف بچی تھی۔ گلیوں میں اندھیرا تھا۔ اگر روشنی تھی تو جلتے ہوئے مکانوں کی تھی۔ یہ روشنی بڑی خوفناک تھی۔ گلیوں میں لاشیں تھیں۔

فساد کچھ کم ہوگیا تھا۔ لوٹ مار ہو رہی تھی۔ شور بہت تھا۔ عورتوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہندو اور سکھ مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو خراب کر رہے تھے یا انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر ساتھ لے جا رہے تھے۔ میں نے ایسے کئی دردناک منظر دیکھے۔ میں کافروں کے قریب سے بھی گزرا جو سامان اٹھائے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ مجھے کسی نے نہیں روکا۔

میں جب اپنی گلی میں داخل ہوا تو گلی چار پانچ جلتے ہوئے مکانوں کے شعلوں سے روشن تھی۔ یہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ لاشیں اتنی کہ مجھے ان کے اوپر سے گزرنا پڑا۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ میں اپنے گھر میں داخل ہوگیا۔ ڈیوڑھی میں مجھے ٹھوکر لگی اور میں گر پڑا۔ یہ کسی کی لاش تھی۔ بتی جلا کر دیکھا۔ چچا مرا پڑا تھا۔ اس کی کھوپڑی کھلی ہوئی تھی۔ دو قدم دور اس کے بڑے بیٹے کی لاش پڑی تھی۔ صحن میں چچی اور اس کے چھوٹے بیٹے کی لاشیں تھیں۔ صحن میں سامان بکھرا ہوا تھا۔ اوپر کی منزل میں بتی جل رہی تھی۔ میں دوڑ کر اوپر گیا۔ فرش پر بھابھی کی نیم برہنہ لاش پڑی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔

وہ کافروں کی درندگی سے شاید مرگئی تھی۔

اچانک بچّی کے رونے کی آواز سُنائی دی مگر پلنگ خالی تھا۔ مَیں نے اسے ڈھونڈا۔ وہ پلنگ کے نیچے پڑی رو رہی تھی۔ اسے کافروں نے شاید ماں کے پہلو سے اُٹھا کر نیچے پھینک دیا تھا۔ چار مہینے تو اس کی عمر تھی۔ وہ سوئی رہی۔ بچّی کو اُٹھایا اور سینے سے لگا کر نیچے اُتر آیا۔ کمروں کی بتیاں جلا کر جلدی جلدی دیکھا۔ سب کچھ لُوٹ لیا گیا تھا۔ چچا کی چھوٹی لڑکی جس کی عمر اُس وقت پندرہ سولہ سال تھی غائب تھی۔

مَیں باہر کو دوڑ پڑا۔ صبح سے پہلے پہلے مَیں دُور نکل جانے کی کوشش میں تھا۔ میں کلہاڑی گھر میں ہی پھینک آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پاکستان بن گیا ہے اور مجھے لاہور پہنچنا ہے۔ لُوٹ مار ختم ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کے کئی مکان جل رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی عورت کی چیخیں اور آہ و زاری سُنائی دیتی تھی۔ میں دوڑتا ہُوا قصبے سے نکل گیا۔ سڑک پر جانے سے گریز کیا۔ کھیتوں میں چلتا گیا۔ بچّی بھوک سے رو رہی تھی۔ مَیں نے اپنی ایک اُنگلی اس کے منہ میں دے دی جسے وہ چوسنے لگی اور چُپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب بچّی کے پیٹ میں کچھ بھی نہ گیا تو پھر رونے لگی۔ مَیں نے اس کے منہ سے اُنگلی نکال لی اور دوڑ پڑا۔ بچّی روتی رہی۔ مَیں نے پھر اُنگلی اس کے منہ میں دے کر اسے چُپ کرا دیا۔ مَیں کبھی چلتا کبھی دوڑتا۔ ایک جگہ مجھے ایک کھالی نظر آ گئی۔ اس میں نہر کا پانی بہہ رہا تھا۔ مَیں نے چُلّو سے بچّی کے منہ میں پانی ڈالا اور پانی سے اس کا پیٹ بھر دیا۔ مَیں پھر چل پڑا۔ رات بھر کا جاگا ہُوا تھا اور خوف بھی طاری تھا اس لیے جسم میں طاقت نہ رہی۔ مَیں قدم

گھسیٹتا گیا اور صبح طلوع ہونے لگی۔

صبح کی رُوشنی نے مجھے جو رنگ دکھائے وہ آپ کو نہیں دکھا سکتا۔ ان تفصیلوں میں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ جو لاکھوں مسلمان اُدھر سے آئے ہیں وہ اللہ کے ان رنگوں کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ وہ تو آگ اور خون کا دریا تھا جس میں سے گزر کر ہم آئے تھے۔ جس طرح دُودھ پیتی بچّی میں نے اُٹھائی ہوئی تھی اسی طرح سینکڑوں ماؤں نے دُودھ پیتے بچّے سینوں سے لگا رکھے تھے اور منزل بہت دُور تھی۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ منزل تک پہنچ جائیں گے۔ میری بچّی کا زندہ رہنا اس لیے ناممکن تھا کہ اس کی ماں ساتھ نہیں تھی۔ بچّی کو پلانے کے لیے دُودھ نہیں تھا۔ فصل کھڑے تھے اور مَیں چلا جا رہا تھا۔ سورج اُوپر اُٹھتا آ رہا تھا اور گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔

بچّی نے پھر رونا شروع کر دیا۔ وہ بھوکی تھی۔ پانی سے بھوک نہیں مرسکتی تھی۔ اللہ کے کرشمے دیکھئے۔ ایک بکری چرتی نظر آئی۔ اس کے تھن دُودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ مَیں نے کئی مویشی دیکھے تھے جو آوارہ پھر رہے تھے۔ یہ بکری کسی مسلمان دیہاتی کی ہو سکتی تھی۔ وہ بے چارے بھاگ گئے ہوں گے۔ مَیں نے بچّی کو درخت کے سائے میں لٹا دیا۔ وہ بُری طرح چیخ رہی تھی۔ مَیں نے تھوڑی بھاگ دوڑ کر کے بکری کو پکڑ لیا اور اسے بچّی کے پاس لے گیا۔ بکری کو بچّی کے قریب گرا کر مَیں اس کے اُوپر بیٹھ گیا۔ بچّی کو اس کے پیٹ کے قریب کر لیا۔ بکری کو مَیں نے پہلو کے بل دبا رکھا تھا۔ ایک ہاتھ سے بکری کا تھن پکڑا، دوسرے ہاتھ سے بچّی کا منہ پکڑا اور تھن اس کے مُنہ میں ڈال کر دبانے لگا۔ دُودھ بچّی کے منہ

میں جلنے لگا۔ جب بچی نے خود منہ پرے کیا تو میں نے تھن چھوڑ دیا۔ اس کا پیٹ بھر گیا تھا۔ پھر میں نے بکری کے تھن باری باری اپنے منہ میں ڈالے اور دودھ پی لیا۔

میں بہت خوش تھا کہ اس بکری کو لاہور تک ساتھ رکھوں گا۔ میں بکری سے اٹھا اور بچی کو اٹھایا۔ جب میں بکری کو پکڑنے لگا تو وہ بھاگ گئی۔ اس سے پہلے وہ اتنی تیز نہیں بھاگی تھی۔ میں نے اسے فوراً پکڑ لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اس کا دودھ اترا ہوا تھا۔ کسے ہوئے تھن اسے دوڑنے نہیں دیتے تھے۔ اب اس کے تھن خالی تھے۔ میں اس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ تیز تھی اور میں تھکا ہوا۔ بچی کو زندہ رکھنے کا ایک سہارا ملا تھا وہ بھی گیا۔

میں درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ بچی کو دیکھا۔ وہ ننھے ننھے ہاتھ مار رہی تھی۔ وہ خوش اور مطمئن تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیے۔ نہ جانے وہ کیسی رَو تھی جو میرے جسم میں پھر گئی اور میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے بچی کا منہ اپنے منہ سے لگا لیا اور میں بہت دیر روتا رہا۔ مجھے اُس پیار کی لذت واپس مل گئی جو ماں اپنی قبر میں لے گئی تھی۔ میں بڑی لمبی مدت سے پیار کے لیے ترس رہا تھا اور جب اپنی بچی کے روئی جیسے گال اپنے منہ سے لگائے تو مجھے احساس ہوا کہ میں کیسی جان لیوا پیاس میں زندہ رہا ہوں۔ پھر میری تھکن کم ہونے لگی۔ دل میں ہمیشہ جو اکڑا اکڑا رہتا تھا وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ سینے میں جو جلن رہتی تھی وہ سرد پڑ گئی اور میرا دماغ بھی صاف ہو گیا۔ اس پر تو ہمیشہ کالی گھٹائیں چھائی رہتی تھیں۔

جب دماغ صاف ہوا تو پہلی سوچ یہ آئی کہ میں موت کے پیٹ میں بچی کو لیے بیٹھا ہوں اور مجھے بچی کو بچانا ہے اور اگر بچی نہ رہی تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ کہاں بیٹھا ہوں۔ میں فوراً اٹھا اور چل پڑا۔ کوئی ایک میل دور مجھے بہت سے لوگوں کے ہیولے سے نظر آئے۔ وہ جلوس کی صورت میں جا رہے تھے۔ میں تیز تیز چلتا قریب چلا گیا۔ چھپ کر دیکھا۔ وہ مسلمان تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے۔ بڑا لمبا جلوس تھا۔ یہ لٹے ہوئے مہاجرین کا قافلہ تھا۔ اس قافلے میں بیل گاڑیاں بھی تھیں، بیل اور بھینسیں بھی تھیں اور چند ایک پرانی قسم کے یکے بھی تھے۔

میں اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ وہ سب دیہاتی تھے۔ ایک سے پوچھا —— "کہاں جا رہے ہو؟" —— اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خالی تھیں۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ چہرے پر خوف اور ہراس تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں ذرا پیچھے ہو گیا۔ وہ سب خاموش تھے۔ بعض عورتیں رو رہی تھیں۔ کسی عورت کے بین بھی سنائی دے رہے تھے۔ کوئی کسی کے ساتھ بات نہیں کر رہا تھا۔ مردوں کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں خدا کو یاد کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے قدم گھسیٹتے جا رہے تھے۔ میں نے تین بچے دیکھے جو باری باری گرے اور انہیں کندھوں پر اٹھا لیا گیا۔

ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا —— "لاہور کتنی دور ہے؟" —— میں نے بلا سوچے سمجھے کہا —— "شام سے پہلے پہنچ جائیں گے" —— معلوم نہیں میرا جواب صحیح تھا یا غلط۔ اس کا اثر بہت اچھا تھا۔ وہ آدمی بھی خوش ہو گیا اور میرے اندر بھی

خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہم چلتے گئے، چلتے ہی گئے۔ سورج نے سر پر آکر ہمیں جلانا شروع کردیا۔ بچّے پیاس سے بلبلانے لگے۔ انہوں نے سڑک کے کنارے بارش کا جو پانی جمع تھا وہ پیا۔ پھر میری بچّی کو بھوک لگ گئی۔ وہ پہلے تو روئی پھر چیخنے لگی۔ میں پریشان ہوگیا۔

میرے پیچھے دو تین آدمی اور ان کے پیچھے کچھ عورتیں آرہی تھیں۔ میں پریشان ہوکر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ بچّی چیخ رہی تھی۔ پیچھے سے ایک آدمی میرے قریب آیا اور مجھ سے پوچھا۔ "بچّی کی ماں کہاں ہے؟"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "مر گئی ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "ماری گئی ہے یا مر گئی ہے؟"

"ماری گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "سارے ہی مارے گئے ہیں۔ یہی بچّی زندہ ہے۔ بھوک سے رو رہی ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے پیچھے نہیں دیکھا۔ وہ پھر میرے پاس آگیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سڑک سے اُتار کر پرے لے گیا۔ مجھے روک کر اس نے کسی کو سر سے اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا، ایک جوان دیہاتی عورت ہماری طرف آ رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے روتے روتے بچّی میرے ہاتھوں سے لی اور ذرا پرے جاکر ہماری طرف پیٹھ کرکے بیٹھ گئی۔ اس نے بچّی کو دُودھ پلانا شروع کردیا۔

اس آدمی نے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے۔ ہماری ایک ہی دُودھ پیتی بچّی تھی۔ وہ ماری گئی ہے۔ چار دن ہوگئے ہیں۔ بیوی کو دُودھ آجاتا ہے تو اسے

بہت تنگ کرتا ہے۔ اس قافلے میں بہت سی مائیں اسی مصیبت میں مبتلا ہیں ان کے دُودھ پیتے بچّے مارے گئے ہیں۔ وہ راستے میں اُن بچّوں کو دُودھ پلاتی آرہی ہیں جن کی مائیں ماری گئی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ ہمارے ساتھ رہنا۔ اللہ کارساز ہے۔"

ستائیس سال گزر گئے ہیں مگر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھڑی نہیں گزری جب وہ عورت میری بچّی کو دُودھ پلا رہی تھی اور اس کا خاوند مجھے کہہ رہا تھا ——"وہ اُن بچّوں کو دُودھ پلاتی آرہی ہیں جن کی مائیں ماری گئی ہیں" —— وہ وقت ہر وقت میرے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ ان ماؤں نے جن کے بچّے اللہ کے نام پر ذبح ہوگئے تھے، کتنے بچّوں کو اپنے دودھ سے زندگی بخشی ہوگی۔ وہ بچّے اب ان عورتوں کو پہچانتے بھی نہیں ہوں گے۔ پیار اور محبت کا یہ مظاہرہ عظیم تھا۔

وہ عورت میری بچّی کو دُودھ پلا چکی تو دوپٹے میں منہ چھپا کر بہت روئی۔ اس کے خاوند نے بچّی اس کی گود سے اٹھا کر مجھے دے دی پھر اپنی بیوی کو اٹھایا۔ وہ روتی ہوئی اٹھی اور روتی ہوئی چل پڑی۔ ہمیں ان کے ساتھ چلنے لگا۔ ہم خاموش تھے۔ شاید اس لیے خاموش تھے کہ ایک دوسرے پہ جو گزری تھی وہ جانتے تھے۔

سورج آگے چلا گیا تھا۔ بچّی پھر رونے لگی تو اس عورت نے خود ہی بچّی مجھ سے لے لی اور ایک جگہ بیٹھ کر اسے دُودھ پلانے لگی۔ میں ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے چھوٹا سا ایک گاؤں نظر آیا۔ ڈیڑھ دو سو گز دُور ہوگا۔ غیر آباد لگتا تھا۔ بلکہ تین چار مُرغیاں دکھائی دیں۔ میں نے اس عورت کے خاوند سے پوچھا۔ "چاقو ہے؟"

اس نے کمربند سے چھُری نکال دی۔ مَیں نے اسے کہا ـــ "میرا انتظار کرنا" اور مَیں مرغیوں کی طرف دَوڑ پڑا۔ ایک مُرغی فصل میں گھس گئی۔ تھوڑی سی کوشش سے اسے پکڑ لیا اور ذبح کر دیا۔ وہیں بیٹھ کر اس کی کھال اُتاری۔ بھوک کا یہ حال تھا کہ مَیں یہ مُرغی کچّی کھانے پر تیار ہو گیا۔ لیکن مَیں خود نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اسے صاف کیا اور دوڑتا ہوا واپس آیا۔ اس آدمی سے ماچس مانگی تو اس نے ماچس بھی نکال دی۔ کچھ گھاس، کچھ سوکھی ٹہنیاں اکٹھی کر کے آگ جلائی اور سالم مُرغی اس پر رکھ دی۔ آگ میں گھاس اور ٹہنیاں پھینکتا رہا۔ مُرغی کو ایک ٹہنی سے اُلٹا پلٹا رہا۔ بہت دیر گزر گئی۔

مُرغی کھانے کے قابل ہو گئی۔ مَیں نے پُوری کی پُوری مُرغی اس جوان عورت کو پیش کر دی جو میری بچّی کو دُودھ پلاتی تھی۔ اس نے خاوند کی طرف دیکھا ـــ اس نے کہا ـــ "لے لو۔ کھا لو"

اس نے مُرغی کی ایک ٹانگ توڑ کر مجھے دی لیکن مَیں نے نہیں لی۔ وہ آدھی مُرغی کھا گئی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا پیٹ بھر گیا ہے تو باقی مُرغی مَیں نے اور اس کے خاوند نے کھائی۔ ہندوستان کی یہ آخری چیز تھی جو ہم نے کھائی۔ ہم چلتے رہے۔ راستے میں بوڑھے اور بچّے گرتے رہے۔ ان کے لواحقین انہیں اُٹھاتے رہے۔

مَیں نے لوگوں کو سڑک کے کنارے قبریں کھودتے بھی دیکھا اور پھر رات نے قافلے کو چھپا لیا۔ مَیں اس میاں بیوی کے ساتھ رہا۔ دونوں کے بہت سے رشتہ دار ساتھ تھے۔ رات تھوڑی دیر آرام کیا اور ابھی رات ہی تھی کہ ہم پھر چل پڑے۔

وہ عورت میری بچّی کو دُودھ پلاتی رہی۔ صبح ہُوئی، دوپہر ہُوئی پھر شام ہُوئی اور شام ابھی اندھیری نہیں ہُوئی تھی جب ہم ستلج پار کر آئے اور پاکستان میں داخل ہُوئے۔ وہاں سے ہمیں لاہور بھیج دیا گیا۔ والٹن کے ریفیوجی کیمپ میں ہم چار مہینے سے کچھ دن اُوپر رہے۔ مَیں نے اس عورت کی بہت خدمت کی۔ وہ مجھ سے چھ سات سال بڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میری بچّی کو نہیں بلکہ مجھے دُودھ پلا رہی ہو۔ وہ میری ماں تھی۔

ایک روز اُس نے مجھے کہا ـــ "یہ بچّی اب میرے پاس ہی رہنے دو۔ یہی سمجھوں گی کہ جو بچّی مر گئی تھی وہ مجھے واپس مل گئی ہے۔ یہ بچّی واپس دینے کو جی نہیں چاہتا"

مَیں نے اسے کہا ـــ "اس بچّی کے سوا میرا اپنا کوئی بھی نہیں رہا۔ مجھے بھی ساتھ رکھو"

یہ باتیں ہم جذبات کے زور پر کر رہے تھے۔ پھر ایسے ہی ہُوا جیسے ہم نے سوچا تھا۔ اس دیہاتی خاندان نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ دَوڑ دھُوپ کر کے زرعی زمین حاصل کر لی۔ یہ دوڑ دھوپ اس سفر سے زیادہ کٹھن اور صبر آزما تھی جو ہم نے پاکستان تک طے کیا تھا۔ مَیں جس کنبے کے ساتھ تھا وہ سب اَن پڑھ دیہاتی تھے۔ مَیں میٹرک پاس تھا۔ یہ تھوڑی سی تعلیم زمین الاٹ کرانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ کم از کم درخواستیں لکھوانے کی محتاجی نہیں تھی۔ آخر کار ہم نئی زمین پر جا کر آباد ہو گئے۔

چار سال بعد سرکاری اہل کاروں نے مجھے بھی چالاک اور ہوشیار بنا دیا

میں نے اپنے نام بھی زمین الاٹ کرالی۔ میں اسی چک میں رہا۔ جہاں یہ کُنبہ آباد ہوا تھا۔ وہیں اسی برادری سے مجھے رشتہ مل گیا اور شادی کرلی۔ بچّی کو اسی عورت نے پالا جو اسے دُودھ پلاتی رہی تھی۔ جب میری شادی ہُوئی تو اس کا ایک بچّہ پیدا ہوچکا تھا۔ میں نے ایک بار سوچا کہ اس سے اپنی بچّی واپس لے لُوں لیکن مجھے اپنی بچّی کی ماں کی سوتیلی ماں یاد آگئی۔ اس کے علاوہ میں اُس عورت سے بچّی لینا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو بتادیا تھا کہ وہ میری پہلی بیوی کی بچّی ہے اور اسے اسی عورت نے زندگی دی ہے۔

میں نے کاشت کاری کو ہی پیشہ بنا لیا۔ سبزیوں وغیرہ کا باغ بھی بنا لیا۔ پھر کچھ زمین خرید بھی لی اور اس کے ساتھ ساتھ اچھی قسم کی کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔ ایک خلش ہر وقت سینے میں رہی کہ میں گناہگار ہوں۔

میں اپنی وکالت میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آج جب اپنی کہانی لکھ رہا ہوں، گناہ کا بوجھ کچھ کم ہوگیا ہے۔ میں آپ سے یہ درخواست نہیں کروں گا کہ مجھے مجرم نہ سمجھیں، البتہ یہ عرض ضرور کروں گا کہ کسی عورت کو اولاد پیدا نہ کرنے کے جرم میں طلاق کی سزا دینے سے پہلے میری کہانی ایک بار پھر پڑھ لیں۔ یہ آپ بیتی سُنانے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ نے اپنی آنکھوں پر جو پٹّی باندھ رکھی ہے وہ آپ کھول دیں۔

☆ ☆

میں نے باپ کی خاطر شادی نہیں کی تھی

دوسرے دن وعدے کے مطابق مزرعہ نے کھیتوں میں عائشہ کو زہر کی پڑیا دے دی اور کہا کہ یہ باؤلے کُتوں اور کھیتوں کے جنگلی چُوہوں کو مارنے کے کام آتا ہے۔ عائشہ کے دل میں آئی کہ یہ زہر خود کھالے۔

راوی: عائشہ

تحریر: فریدہ تبسّم

میں نے جب سُنا کہ اس عورت نے اپنے سگے باپ کو زہر دے کر قتل کیا اور قید کی سزا بھگتی تھی تو میں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس عورت سے میں نے بچپن میں قرآن پڑھا تھا۔ محلّے کی بہت سی بچیوں کو اس نے قرآن مجید پڑھایا تھا۔ محلے کا وہ کون سا گھر ہوگا جو اسے اپنے کنبے کا فرد نہ سمجھتا ہوگا۔ وہ بعض گھروں کے اُوپر کے کام بھی کیا کرتی ہے۔ اب اس کی عمر ساٹھ کے قریب ہے۔ بال سفید ہو چکے ہیں۔ وہ یہاں ۱۹۴۸ء میں آئی تھی۔ اُس وقت اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ہندوستان سے آئی تھی۔ کچھ عرصہ ریفیوجی کیمپوں میں گزارا اور کوئی نیک آدمی اُسے یہاں لے آیا۔ ایک ہندو کا چھوڑا ہُوا بہت بڑا مکان تھا۔ نیچے والی منزل کا چھوٹا سا ایک حصّہ اسے دلا دیا گیا اور وہ اسی جگہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ میں برائے مصلحت اس کا فرضی نام عائشہ استعمال کروں گی۔

دو اڑھائی سال پہلے کی بات ہے کہ یہ پردہ اُٹھا تھا کہ عائشہ نے جوانی میں، شادی سے پہلے، اپنے باپ کو دودھ میں زہر دے کر مار ڈالا اور پکڑی گئی تھی۔

یہ واقعہ مشرقی پنجاب کے ایک قصبے کا ہے۔ یہ پردہ اتفاق سے اُٹھا تھا۔ انسان زندہ رہیں تو کہیں نہ کہیں برسوں کے بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ہمارے محلے کے ایک خاندان نے اپنے ایک لڑکے کا رشتہ کہیں دُور پار کیا۔ اُس خاندان کے کچھ لوگ لڑکے کو دیکھنے اور منگنی کی رسم کرنے آئے۔ ان میں ایک بوڑھا اور ایک بُڑھیا تھی۔ عائشہ لڑکے والے گھر کام کاج کے سلسلے میں موجود تھی۔

اس بوڑھے اور بُڑھیا نے باتوں کے دوران عائشہ کو پہچان لیا۔ کہتے ہیں کہ وہ بہت گھبرائی تھی۔ یہ بوڑھا اور بڑھیا اس کی غیر موجودگی میں بتا گئے کہ اُس نے اپنے باپ کو زہر دیا تھا۔ انہوں نے جو کہانی سُنائی تھی۔ اس میں سوتیلی ماں کا بھی ذکر تھا۔ یہ مہمان اپنی بیٹی کی منگنی کر کے چلے گئے اور عائشہ کے لیے یہ مسئلہ پیدا کر گئے کہ وہ اسی محلّے میں رہے کہ کہیں بھاگ جائے۔

چار دیواری کی دنیا میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جنہیں کسی کے خلاف ہلکا سا اشارہ چاہیئے، باقی کہانی وہ خود گھڑ لیا کرتے ہیں۔ عورتیں اس فن میں مہارت رکھتی ہیں۔ یہ فن ان کی تفریح کا ذریعہ ہے اور اسی فن کے ذریعے وہ اپنی اُلٹی سیدھی حرکتوں پہ پردہ ڈالا کرتی ہیں۔ عائشہ کے متعلق بھی زنگار رنگ قصّے مشہور ہونے لگے۔ انہیں لذّت آمیز اور سنسنی خیز بنایا گیا لیکن ۱۹۴۸ سے اب تک عائشہ نے ہمارے محلّے میں اپنی ذات اور اپنے کردار کا جو رنگ ہر کسی کے دل پہ جما دیا تھا، وہ غالب رہا۔

عائشہ نے انکار نہیں کیا مگر اس نے کسی کو پورا واقعہ بھی نہیں سُنایا۔ کوئی پوچھے تو اتنا سا جواب دیتی تھی —— "ہاں، میرا باپ اسی زہر سے مرا تھا جو

میں نے دودھ میں ڈالا تھا" —— اس کے بعد اس کے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے تھے اور اس فرمائش کے جواب میں کہ پوری بات سناؤ وہ کہا کرتی تھی —— "بات سُننے اور سنانے والی ہے لیکن وہ وقت یاد آتا ہے تو اندر باہر سے کانپ جاتی ہوں۔ دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

پھر ایک روز وہ سنانے کے موڈ میں آ ہی گئی۔ وہ مجھے اکیلی مل گئی تھی۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں اسے اپنے سُسرال کے محلّے کی ایک لڑکی کا واقعہ سُنا بیٹھی، جس کا دنیا میں صرف باپ رہ گیا تھا اور یہ لڑکی باپ کی خاطر شادی کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ کہتی تھی کہ میں چلی گئی تو بوڑھے باپ کو کون سنبھالے گا۔

میں عائشہ کو اس لڑکی کے متعلق باتیں سنا رہی تھی تو اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس کے منہ سے آہ کی طرح یہ الفاظ نکل گئے —— "میں نے بھی باپ کی خاطر شادی نہیں کی تھی۔ کیا خبر تھی کہ جس کے لیے میں جوانی کی قربانی دے رہی تھی وہ میرے ہی ہاتھوں دیئے ہوئے زہر سے مرے گا۔"

وہ ایسی روئی کہ اُس نے میرے بھی آنسو نکال دیئے۔ میرے دل میں عائشہ کا احترام پیروں اور مرشدوں والا ہے۔ سکول کی اُستانیوں اور کالجوں کی لیکچرروں کا اتنا احترام نہیں جتنا عائشہ کا ہے۔ اس نے مجھے قرآن پڑھایا تھا۔ اس کے مقابلے میں میں اپنی بی۔ اے کی ڈگری کو کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ اس روز ہمارے درمیان اتنی رازداری پیدا ہو گئی کہ عائشہ نے اپنے دل کا بوجھ میرے آگے اتار دیا۔

اس کی کہانی یوں ہے کہ وہ مشرقی پنجاب کے ایک قصبے کی رہنے والی تھی۔ اس کا باپ امیر زمیندار تھا۔ قصبے میں بھی جائداد تھی اور قصبے کے قریب ہی بہت سی

زمین زیرِ کاشت تھی۔ کوئی مرد نہ تھا اس لیے زمین مزارعوں کے پاس تھی۔ عائشہ گھر میں چھوٹی تھی۔ ایک بڑی بہن تھی جس کی شادی ہوئی تو وہ دو سال بعد مرگئی۔ ایک بڑا بھائی تھا جس کی شادی ہوئی تو بیوی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ لڑکی چالاک تھی۔ اس کی ماں اُس سے زیادہ شیطان تھی۔ انہوں نے عائشہ کے بھائی کو اپنے جال میں ایسا پھانسا کہ وہ ماں باپ سے صرف الگ ہی نہیں ہوا بلکہ باپ سے جائداد کا حصّہ بھی وصول کر لیا اور گھر سے تعلق توڑ دیا۔ اس نے قصبے سے تین چار میل دُور ایک گاؤں میں مکان بنا لیا تھا۔

عائشہ کے باپ نے تو یہ صدمہ سہہ لیا ماں برداشت نہ کر سکی۔ ایک شادی شُدہ بیٹی کی مُوت دوسرا بیٹے کی جُدائی، وہ بیمار رہنے لگی۔ اس نے کوئی خانقاہ نہیں چھوڑی جہاں جا کے ماتھا نہ رگڑا ہو۔ پیروں فقیروں سے تعویذ بھی لیے، ٹُونے بھی کیے۔ ایک عورت کو بہت سے پیسے دے کر تعویذ اپنے بیٹے کے مکان کی دیواروں میں دبائے مگر کوئی تعویذ، کوئی ٹونہ، کوئی زندہ اور کوئی مرا ہُوا پیر بیٹے کا دل موم نہ کر سکا۔ اس کی بیوی کے حُسن اور فریب کا جادو بڑا ہی سخت تھا۔ آخر ماں کو ایسا روگ لگا جو اُسے لے بیٹھا۔ وہ مرگئی۔ صرف باپ رہ گیا۔

عائشہ کی عمر بیس اکیس سال ہو گئی تھی۔ رشتوں کے پیغام آرہے تھے جن میں سے کسی کے متعلق ماں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی کیونکہ اُس کا دماغ ماؤف رہتا تھا۔ باپ کوئی رشتہ پسند کرتا تھا تو ماں اس کی مخالفت کرتی تھی۔ یہ اُس کی ذہنی پریشانیوں کا اثر تھا۔ اس کے مرنے کا اثر باپ پر بہت بُرا ہُوا۔ ایک سال تک وہ عائشہ کے رشتے کے متعلق بات تک سُننے کے لیے بھی تیار نہ ہُوا۔

اس نے یہ بھی کہا "اپنی ماں اور بہن بھائی کی نشانی ایک عائشہ رہ گئی ہے اسے کس طرح نظروں سے اوجھل کر دوں"۔

اسے عائشہ کے ساتھ بہت ہی زیادہ پیار تھا اب اس کے لیے صرف عائشہ رہ گئی تھی۔ وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ عائشہ کو اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ باپ بیٹی حقائق کو فراموش کر کے جذبات میں گم رہے۔ وہ رشتے ناطے کا نام ہی نہیں سننا چاہتے تھے۔ برادری نے انہیں جذبات سے نکال لیا۔ باپ ہوش میں آ گیا۔ اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ اسے اپنی بیٹی سے جدا ہونا ہی پڑے گا۔ اس نے اُمیدواروں کی چھان بین شروع کر دی۔ عائشہ سے بھی وہ مشورہ لیتا تھا۔

عائشہ ہر امیدوار میں کوئی نہ کوئی نقص بتا کر باپ کے لیے فیصلہ مشکل بنا دیتی تھی۔ برادریوں کی شادیوں میں پسند کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہوتا ہے۔ پرانی عداوت یا رنجش کی صورت میں بڑے اچھے اچھے رشتے نامنظور کر دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات لڑکی کے کسی امیدوار کی درخواست انتقام کے طور پر ٹھکرا کر کسی ایسے امیدوار کو دے دی جاتی ہے جو لڑکی کے قابل ہی نہیں ہوتا۔

عائشہ نے دو تین اچھے رشتے انہی وجوہات کی بنا پر ٹھکرا دیئے۔ یہ محض بہانہ تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ باپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ اس کے دل میں باپ کی محبت اتنی زیادہ تھی کہ اس نے اپنی جوانی کی سب سے بڑی امنگ کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے باپ کے دوستوں اور قریبی رشتہ داروں نے اسے کہا کہ لڑکی شادی کی عمر سے آگے نکلی جا رہی ہے اس لیے وہ کوئی فیصلہ جلدی کرے۔

اس وقت تک عائشہ چار دیواری میں قید رہنے والی لڑکی نہیں رہی تھی۔ وہ کھیتوں میں جاتی تھی۔ مزارعوں کی نگرانی کرتی اور ان پر حکم چلاتی تھی۔ ہر مسئلہ سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہو گئی تھی۔ گھر کا بھی خیال رکھتی اور مردوں کی طرح مردوں کے ساتھ معاملات بھی طے کرتی تھی۔ باپ کی طرف سے اُسے حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اس لیے اس میں خود اعتمادی اور دلیری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بیٹوں کا رول ادا کرنے لگی تھی۔

باپ نے ایک رشتہ منظور کر لیا اور وعدہ دے دیا۔ عائشہ کہتی ہے کہ اس کے لیے یہ رشتہ ہر لحاظ سے موزوں تھا لیکن یہ مسئلہ کہ باپ کی خدمت کون کرے گا اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس رشتے کو ٹھکرا دے گی۔ باپ نے منگنی کا دن مقرر کر دیا۔ عائشہ نے دیکھ لیا کہ باپ کو اس فیصلے سے ہٹایا نہیں جا سکے گا اس نے یہ دلیرانہ کارروائی کی کہ ایک عورت کی زبانی لڑکے والوں کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ ان کا لڑکا عائشہ کے گھر میں رہنا پسند کرے تو منگنی کے لیے آ جائیں ورنہ وعدہ منسوخ سمجھیں۔ عائشہ اپنے خاوند کو گھر جوائی بنانا چاہتی تھی۔

کوئی عزت دار والدین اپنے بیٹے کو گھر جوائی نہیں بننے دیتے۔ لڑکے والوں کو ایک تو یہ شرط منظور نہیں تھی دوسرے انہیں یہ بُرا لگا کہ پیغام لڑکی نے بھیجا تھا۔ لڑکی کی ایسی جرأت کو کون برداشت کر سکتا ہے۔ انہوں نے عائشہ کے باپ کو اطلاع دی اور رشتہ توڑ دیا۔ باپ کو بہت بُرا لگا۔ اس نے عائشہ سے جواب طلبی کی تو عائشہ نے ایسے جذباتی لہجے میں جواب دیا کہ باپ خاموش ہو گیا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میرے ساتھ جو شادی کرنا چاہتا ہے وہ اسی گھر میں آ کر رہے۔

برادری میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو گھر جوائی بنتا۔ تمام امیدوار خاموش ہو گئے۔ ایک سال تک کہیں سے پیغام نہ آیا۔ یہ بات ہر طرف پھیلا دی گئی تھی کہ عائشہ نے اپنی زبان سے منگنی توڑی ہے۔ اس پر کئی اور الزامات عائد کر دیئے گئے۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ وہ امیر زمیندار کی بیٹی تھی۔ اگر برادری میں اُس کا درجہ اس سے کم ہوتا تو اس کا حقہ پانی بند ہو جاتا۔ بہرحال لوگوں نے اُسے بخشا نہیں۔ اسے منہ پھٹ اور آوارہ تک کہا گیا۔ باپ اس کے جذبے سے واقف تھا۔ اس کے اپنے جذبات بھی عائشہ جیسے ہی تھے لیکن وہ اپنی ذمہ داری کو بھی سمجھتا تھا۔ بیٹی کو گھر نہیں بٹھا سکتا تھا۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ گھر میں نوکروں کی کمی نہیں۔ عائشہ کی غیر حاضری میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

عائشہ نے جذباتی لہجے میں کہا ــــ "میں آپ کو اس عمر میں نوکروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گی" ــــ وہ باپ کی کوئی بھی دلیل ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"تمہیں گھر جوائی ساری عمر نہیں ملے گا" ــــ محلے برادری کی ہر عورت اور ہر سہیلی نے اسے کہا اور یہ بھی کہا کہ جوان لڑکی گھر بیٹھی اچھی نہیں لگتی۔ بدنامی ہوتی ہے مگر عائشہ روز بروز دلیر اور نڈر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے سب سے کہا ــ "میرا بھائی بے غیرت ہے جو ایک عورت کے پیچھے باپ کو دھوکہ دے گیا ہے۔ میں باپ کو بیٹا بن کر دکھاؤں گی"۔

اس نے میرے سامنے بلا جھجک اعتراف کیا کہ اُس کے مزارعوں میں ایک جوان مزارعہ تھا جو عادتوں کے لحاظ سے بھی صاف ستھرا تھا اور لباس وغیرہ کے

لحاظ سے بھی۔ وہ کھیتی باڑی نہیں کرتا تھا۔ عائشہ کے باپ نے اسے اپنا خصوصی ملازم بنا رکھا تھا۔ زیادہ تر گھر میں رہتا اور اِدھر اُدھر کے کام کاج کرتا تھا۔ عقل مند اور ہوشیار تھا۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

عائشہ نے جب اپنے خلاف برادری اور محلے کا پروپیگنڈہ سُنا تو اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس خوبرو مزارعہ کے ساتھ شادی کر لے گی اور اسے اپنے گھر رکھے گی۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ ایک انہونی بات ہے۔ پھر بھی وہ رسم و رواج سے بغاوت پر تیار ہو گئی۔ اس نے مزارعہ کو اسی رنگ میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ اس کی بے تکلفی تو تھی ہی مگر اب اس بے تکلفی میں سے آقا اور غلام کا فرق نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ نوکروں اور مزارعوں کو غلام سمجھنا اور انہیں باعزت مقام سے محروم رکھنا اچھا فعل نہیں۔ اس نے اپنی برادری کے کئی ایک لڑکوں سے اس مزارعہ کا مقابلہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ مزارعہ زمینداروں کے بیٹوں سے بہتر انسان ہے۔

اُس نے اس مزارعہ کو اپنے دل پر سوار کر لیا اور اس کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی شروع کر دی۔ وہ کہتی ہے کہ اس بے تکلفی میں بے حیائی نہیں تھی۔ اس کا ارادہ نیک اور رویہ پاک تھا۔ تھوڑے سے ہی دنوں بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ مزارعہ اس کے دل و دماغ پر غالب آ گیا ہے اور وہ اب اس کی ایک آدھ دن کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ کھیتوں میں تو کبھی کبھی جایا ہی کرتی تھی مگر اب وہ زیادہ جانے لگی اور اس مزارعہ کو بہانے بنا بنا کر اپنے ساتھ رکھنے لگی۔

مزارعہ معلوم نہیں اس کی نیت سمجھ سکا تھا یا نہیں، وہ اپنائیت کا جواب

اپنائیت سے ہی دیتا تھا۔ کرتے کرتے یہ جوان سال آدمی اس کی رُوح میں اُتر گیا اور وہ اُسے دیوانہ وار چاہنے لگی۔ ایک روز اس نے بے قابو ہو کر مزارعہ سے کہہ دیا کہ وہ اسے نوکر نہیں اپنا آقا سمجھتی ہے۔ مزارعہ گھبرایا۔ عائشہ نے اسے بتایا کہ وہ اُسے بغیر نکاح کے اپنا خاوند نہیں بنانا چاہتی۔ یہ تو مزارعہ نے بھی دیکھا تھا کہ عائشہ نے اس کے ساتھ کبھی کوئی غیر شریفانہ بات نہیں کی تھی۔

مختصر یہ کہ عائشہ نے مزارعہ کو اپنی محبت کا قائل کر لیا۔ ایک روز اس نے مزارعہ سے کہا کہ اگر وہ اسے کہے کہ آؤ شادی کر لیں تو کیا وہ مان جائے گا؟ مزارعہ ہنس کر بولا — "بی بی جی! ستارے ٹوٹ جایا کرتے ہیں، دو ستارے کبھی ایک نہیں ہوئے۔ یہ آسمانوں کا قانون ہے جو زمین پر بھی چلتا ہے۔ آپ زمین کا ستارہ ہیں۔ مجھے آپ اپنے جیسا سمجھتی ہیں ہم ٹوٹ کر ایک دوسرے کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے، مِل نہیں سکیں گے۔"

عائشہ نے ذہن میں ایسی سوچیں بٹھالی تھیں جو عملی شکل میں کبھی آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ اس نے مزارعہ سے کہا کہ وہ مذاق نہیں کر رہی۔ وہ اپنے باپ سے بات کرے گی اور ساری دنیا کو دکھائے گی کہ نوکر انسان ہوتے ہیں اور گھر کے مالک بھی بن سکتے ہیں۔

مزارعہ نے ہاتھ جوڑ کر عائشہ سے کہا — "خدا کے لیے ایسی بات اپنے والد صاحب سے نہ کہنا ورنہ وہ مجھے جان سے مروا دیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ میں آپ کو ورغلاتا ہوں۔ ہو سکتا وہ میرے پورے خاندان کو زمینوں سے بے دخل کر دیں۔"

عائشہ پر جذبات کا غلبہ تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ دلیر ہو گئی تھی۔ اسے

مزارعہ کی بات پلّے نہ پڑی۔ مزارعہ نے اُسے بتایا کہ آسمان ٹوٹ کر زمین پر آ سکتا ہے، ایک مزارعہ کسی زمیندار کی بیٹی کا خاوند نہیں بن سکتا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ کہیں بھاگ جائیں اور شادی کر لیں مگر وہ اس پر بھی رضامند نہیں ہو گا۔ اس نے کہا کہ یہاں شادی ہو نہیں سکتی اور وہ نمک حرامی کر نہیں سکتا۔ جس معاشرے میں دو ذاتوں کی شادی نہیں ہو سکتی وہاں مزارعہ اور مالکن کی شادی کو صرف تصوّر میں لانا جُرم ہے۔

عائشہ سٹپٹائی۔ اس کے لیے مزارعہ کی باتیں نئی اور عجیب نہیں تھیں۔ وہ تو ناممکن کو ممکن بنانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

ایک روز باپ نے اسے ایک بار پھر کہا کہ وہ گھر جوائی کی امید دل سے نکال دے اور فلاں رشتہ قبول کر لے۔

عائشہ نے کہا — "ابّا جان! میرے دل میں آتی ہے کہ کسی مزارعے کے بیٹے کے ساتھ شادی کر کے ساری برادری کو شرمسار کر دوں۔"

"برادری کیوں شرمسار ہو گی؟" — باپ نے کہا — "شرمساری تو صرف میرے لیے ہو گی۔ برادری میرے سر پر جوتے مارے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ بات غصّے میں کہی ہے لیکن بیٹی یاد رکھنا کبھی غصّے میں یا مذاق میں بھی ایسی بات کسی اور سے نہ کہنا۔ اُونچے گھرانوں کے لوگ ایسی باتیں کسی بھی رنگ میں ذہن میں نہیں لایا کرتے۔"

عائشہ کی زبان سِل گئی۔ مزارعہ کی محبت اس کے دل میں اتنی گہری چلی گئی تھی کہ شادی ہو یا نہ ہو وہ اب اسے دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ گھر سے بھاگنے کی

تو اس نے سوچی ہی نہیں تھی۔ اپنے باپ کی خاطر ہی وہ مزارعے کی بیوی بننے کیلئے تیار ہوگئی تھی۔

باپ کو محلے برادری نے ایسا گھیرا کہ اسے اپنی بیٹی کے لیے کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ بیٹی پر اپنا فیصلہ ٹھونس کر وہ اس کے جذبات کو کچلنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک روز اس نے عائشہ سے کہا ——"بیٹی! میں نے یہ مسئلہ حل کرلیا ہے۔ تمہارے بعد میرا کیا بنے گا۔ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ تمہیں بتائے بغیر میں نے بات طے کرلی ہے۔ آٹھ دس روز تک میرے گھر میں ایک عورت آجائے گی اور اس کے بعد جہاں تم کہو گی تمہاری شادی کردوں گا۔"

عائشہ کہتی ہے کہ اس کا باپ عیش پرست انسان نہیں تھا۔ اس کی عمر بھی شادی والی نہیں تھی۔ اس نے صرف بیٹی کا گھر آباد کرنے کے لیے دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا تاکہ بیٹی کو یہ غم نہ رہے کہ اس کے بعد اس کے باپ کو کون سنبھالے گا مگر عائشہ پریشان ہوگئی۔ اس کا باپ جس عورت کے ساتھ شادی کر رہا تھا، وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ عائشہ کے باپ کی عمر اس سے دگنی تھی۔

عائشہ اس بیوہ سے اور اس کی ماں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ چالاک سی قسم کی عورتیں تھیں۔ عائشہ کو باپ کا یہ فیصلہ پسند نہ آیا لیکن وہ فیصلہ بدل نہ سکی۔ ہر گھر تک یہ خبر پہنچ گئی کہ عائشہ کا باپ فلاں عورت کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ کسی نے بھی نہ سوچا کہ وہ شادی کیوں کر رہا ہے۔ سب یہی کہتے تھے کہ اسے اپنی بیٹی کا کوئی خیال نہیں اور اس عمر میں اپنا بیاہ رچا رہا ہے۔

عائشہ کی ہمدرد عورتوں نے اسے بتایا کہ اس بیوہ کی ماں جائیداد کے لالچ میں اپنی جوان بیٹی تمہارے بوڑھے باپ کو دے رہی ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ سب جائیداد کا چکر تھا۔ عائشہ نے باپ سے کہا کہ وہ اب شادی کرلے گی لیکن باپ کی شادی کے کچھ عرصہ بعد کرے گی۔ اس نے باپ کو بتایا کہ جسے اس نے پسند کیا ہے وہ اور اس کی ماں اچھی شہرت کی عورتیں نہیں ہیں۔ اس لیے وہ کچھ عرصہ گھر رہ کر دیکھے گی کہ ان کا رویہ اس کے باپ کے ساتھ کیسا ہے اور ان کی نیت کیا ہے؟

باپ کی شادی ہوگئی۔ عائشہ کو سوتیلی ماں مل گئی جو اس سے ڈیڑھ ایک سال بڑی تھی۔ خوبصورت عورت تھی۔ وہ آتے ہی گھر کی ملکہ بن گئی۔ عائشہ نے اس کے ساتھ ہم عمر سہیلیوں والی بے تکلفی پیدا کرنا چاہی جو سوتیلی ماں نے قبول نہ کی۔ اس نے عائشہ سے کہا کہ وہ بہت جلدی اس کی شادی کا بندوبست کرنا چاہتی ہے۔

گھر کے جو دو تین نوکر تھے انہیں اس نے اپنے حکم کے تحت لے لیا۔ ان میں وہ مزارعہ بھی تھا جسے عائشہ دیوانہ وار چاہتی تھی۔ وہ گھر میں آتا تو سوتیلی ماں اسے کوئی نہ کوئی کام بتا دیتی۔ اس کی ماں دوسرے تیسرے دن آجاتی۔ کبھی سارا دن وہیں رہتی اور کبھی دو دو دن گزار کر جاتی۔

ماں بیٹی نے عائشہ کے باپ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ دونوں اس کی مٹھی چاپی ایسے انداز سے کرتی تھیں جس نے عائشہ کے باپ کی بوڑھی رگوں میں جادو اتار دیا۔ انسانی فطرت کی کمزوریوں نے اس کی عقل پر اور آنکھوں پر بھی پردہ ڈال دیا۔ عائشہ کے ساتھ باپ کا رویہ اس قسم کا ہوگیا کہ عائشہ اپنے معمول کے

مطابق باپ کے پاس جاتی تو باپ اسے کہتا کہ "اسے" بھیجو۔ عائشہ کا دل جلنے لگا۔ اس باپ کی خاطر اس نے جوانی کی امنگیں قربان کر دیں اور ایک مزارعہ تک سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ بے شک اسے اس مزارعہ کے ساتھ دلی لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن یہ سب باپ کے آرام اور سکون کی خاطر تھا۔

اب یہ باپ اس کے لیے اجنبی بنتا جا رہا تھا۔ ایک روز گھر میں زمینوں کے متعلق کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ عائشہ ایسے مسائل سے نمٹنا جانتی تھی۔ اس نے اس مسئلے کا حل پیش کر دیا مگر اس کی سوتیلی ماں نے اسے رد کر کے اپنا فیصلہ دیا جسے باپ نے ہنس کر قبول کر لیا۔

یہ ایسی چوٹ تھی جو عائشہ برداشت نہ کر سکی۔ گھر میں اس کا عمل دخل باورچی خانے تک محدود رہ گیا اور اس کی حیثیت نوکرانی کی سی ہو گئی۔ اس کے بعد اس پر ایک اور ضرب پڑی۔ عائشہ کی نقل کرتے ہوئے سوتیلی ماں کھیتوں میں جا کر مزارعوں پر حکم چلانے لگی۔ ایک روز عائشہ اُدھر گئی تو ایک بوڑھے مزارعہ نے اسے کہا کہ نئی بیگم مزارعوں کو پریشان کرتی ہے اور ان کے سامنے عائشہ کو بدنام بھی کرتی ہے۔ عائشہ اس بوڑھے مزارعہ کے ہاتھوں میں جنی پلی اور کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ اسے عائشہ کے ساتھ دلی پیار تھا۔ اس لیے اس نے عائشہ کو خطروں سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

بوڑھے نے کہا — "بی بی بیٹی! اس بیگم نے اپنے گھر میں کبھی بکری بھی نہیں پالی اور گز بھر کی کھیتی کی کبھی ملکیت نہیں دیکھی، یہ ہم پر کیا حکم چلائے گی۔ ہم بی بی بیٹی تمہارے خلاف کوئی بات نہیں سنیں گے۔"

یہ تو ایک بوڑھا تھا جسے عائشہ کے ساتھ پیار تھا اس لیے وہ اس کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے مزارعوں کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ ایک روز سوتیلی ماں نے عائشہ سے کہا کہ وہ اس کے رشتے کی بات کر رہی ہے اور جلدی ہی اس کی شادی کر دی جائے گی۔ عائشہ نے اسے کہا کہ وہ اس کی شادی کا فکر نہ کرے، وہ خود کرے گی۔ رات کو اس کے باپ نے بھی اسے یہی بات کہی۔ عائشہ نے باپ کو بھی یہی جواب دیا۔

سوتیلی ماں نے باپ بیٹی کو بھڑکا دیا جس سے باپ بیٹی میں ترش کلامی ہو گئی۔ اس رات عائشہ بہت دیر روتی رہی۔ اس کے رونے میں عورتوں والی بے بسی اور غلامی نہیں تھی، وہ جوابی حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ وہ روئی اس لیے تھی کہ باپ کے ساتھ اتنی عمر میں پہلی بار ترش کلامی ہوئی تھی اور باپ نے پیار کی بجائے حکم کے لہجے میں بات کی تھی۔ یہ اس کا ثبوت تھا کہ اس کی سوتیلی ماں نے اس کے باپ پر پوری طرح قبضہ کر لیا تھا۔ عائشہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ سوتیلی ماں کا منظور کیا ہوا رشتہ نامنظور کر دے گی۔

پھر ایک ایسا واقعہ یا حادثہ ہو گیا جس نے عائشہ کو پاگل کر دیا۔ اس کا باپ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ عائشہ بھی کسی سہیلی کے گھر چلی گئی۔ کچھ وقت بعد وہ باہر کی طرف سے واپس آنے کی بجائے چھتوں کے اُوپر اُوپر سے آئی۔ چار پانچ گھروں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ اپنی سیڑھیوں سے اُتر کر برآمدے میں آئی تو ایک کمرے کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے کواڑ دھکیلا تو کمرے میں اُسے جو منظر نظر آیا اس نے اس پر غشی کی کیفیت طاری کر دی۔ اس نے اپنے محبوب

مزارعہ کو اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ ایک ہی پلنگ پر بڑی ہی نازیبا حالت میں دیکھا۔ مکان کا بڑا دروازہ اندر سے بند تھا۔

اسے کوئی ہوش نہ رہا کہ مزارعہ کب اور کس طرح گھر سے نکل کر گیا۔ اسے اتنا یاد ہے کہ سوتیلی ماں اس کے سامنے کھڑی اسے کہہ رہی تھی —— "اگر تم نے اپنے باپ کو بتایا تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ میں تمہارے باپ پہ ثابت کر دوں گی کہ تمہارے اس مزارعہ کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہارا باپ میرے قبضے میں ہے۔ وہ میرے خلاف کوئی بات نہیں سُنے گا۔"

عائشہ کے اردگرد کی ہر چیز گھوم رہی تھی۔ اس کی زبان اکڑ گئی، عقل ماری گئی اور اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ صرف یہ احساس زندہ رہا کہ اس کے اندر آگ بھڑک اُٹھی ہے اور وہ جل جل کر مر جائے گی۔ شام کو وہ کھیتوں کی طرف چلی گئی۔ اس نے مزارعہ کو بلایا اور اسے پرے لے گئی۔ مزارعہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ عائشہ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔

مزارعہ نے ہاتھ جوڑ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا —— "بی بی جی! میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں مجبور تھا۔ نئی بی بی نے جس طرح مجھے اپنا قیدی بنایا ہے وہ ضرور سن لیں۔ میری کیا حیثیت ہے؟ آپ یہ سمجھ لیں کہ میرے ساتھ وہی ہوا ہے جو عیاش زمیندار مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ نے مجھے بڑا ہی پاک پیار دیا ہے مگر نئی بیگم بدمعاش عورت ہے۔"

مزارعہ نے اُسے بتایا کہ عائشہ کی سوتیلی ماں نے اسے پہلے غلاموں کی طرح اپنے حکم کا پابند کیا، پھر پیسے دینے لگی۔ ساتھ ہی ڈرانے دھمکانے لگی۔ اس سے

اکثر پوچھتی تھی کہ عائشہ کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے ہیں۔ مزارعہ نے اسے قسمیں کھا کر بتایا کہ عائشہ اُسے بہت پسند کرتی ہے۔ لیکن ہر لحاظ سے شریف لڑکی ہے۔ مزارعوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ان سے ہر طرح کے حکم منوائے جاتے ہیں۔ اس مزارعہ کو نئی بیگم نے یہ دھمکی دے کر اپنا پالتو جانور بنا لیا کہ اس نے حکم نہ مانا تو عائشہ کے باپ سے یہ کہہ کر کہ اس مزارعہ نے اُس کی (نئی بیگم) عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے، کھال اتروا دے گی۔

مزارعہ اب کچھ بھی کہتا، کیسے کیسے بہانے ہی کیوں نہ پیش کرتا، عائشہ کے دل میں جو آگ لگ چکی تھی وہ بجھ نہیں سکتی تھی۔ مزارعہ نے اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی۔

عائشہ نے اسے کہا — "مَیں نے تمہیں اپنے جتنا درجہ دیا مگر تم پنچ ہی رہے۔ مر جاتے میری محبت کو ایک بدکار عورت کے آگے نہ پھینک دیتے۔"

مزارعہ سوائے رونے کے کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ اِس قدر خوفزدہ تھا کہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ عائشہ کو وہ اچھا لگتا تھا۔ اسے اس پر رحم آ گیا۔ اس سے پوچھا کہ نئی بیگم اس کے ساتھ کیسی باتیں کرتی رہی ہے۔

مزارعہ کو جب تسلّی ہو گئی کہ عائشہ اسے بخش دے گی تو اُس نے کچھ اور انکشاف کیے۔ اس نے عائشہ کی سوتیلی ماں اور اس کی ماں کی باتیں سُنی تھیں۔ ان کے ارادے اس قسم کے تھے کہ وہ عائشہ کے باپ سے ساری جائداد لکھوا لیں گی۔ اس ارادے میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھیں، یعنی باپ رضامند ہو چکا تھا۔ عائشہ کو وہ گھر سے نکالنا چاہتی تھیں اور ایسے آدمی کے ساتھ رشتہ طے کرنے کی کوشش

میں تھیں جو جائداد میں سے عائشہ کا حصہ نہ مانگے۔ مزارعہ نے اتفاق سے ماں بیٹی کے منہ سے ایسے الفاظ بھی سنے تھے جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ جائداد اپنے نام لکھوا کر وہ عائشہ کے باپ کو ختم کر دیں گی۔ اسے کوئی ایسی چیز کھلائیں گی جو اُسے آہستہ آہستہ مار دے گی۔

مزارعہ نے ایک ایسا انکشاف کیا جس نے عائشہ کا رہا سہا دم بھی نکال دیا۔ اس نے بتایا کہ نئی بیگم اور اس کی ماں نے اسے دو تین بار کہا تھا کہ وہ عائشہ کے ساتھ نازیبا حرکت کرے۔ یہ ڈرامہ یوں بنایا گیا تھا کہ مزارعہ عائشہ کی رضامندی سے بیہودگی کرے اور نئی بیگم عائشہ کے باپ کو ساتھ لے کر اسے موقعے پر پکڑے گی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عائشہ کے باپ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کی شادی فوراً کر دے۔ دوسرا مقصد عائشہ کو باپ کی نظروں سے گرانا تھا۔ مزارعہ کو بہت سا انعام پیش کیا گیا لیکن وہ ایسی بیہودگی کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کی بجائے نئی بیگم خود پکڑی گئی مگر عائشہ کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا، اب باپ، اس کی کوئی بات نہیں سنتا تھا۔

ان حالات نے عائشہ کے اندر کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی اور اس کی عقل جواب دے گئی۔ اس کی کوئی ایک بھی عزیزہ ایسی نہیں رہی تھی جس پر سوتیلی ماں نے قبضہ نہ کر لیا ہو۔ اس میں مردوں والی دلیری بھی تھی۔ اس نے اس پاگل پن والی ذہنی اور جذباتی حالت میں مزارعہ سے کہا ___ "میں تمہیں اس شرط پر بخش سکتی ہوں کہ مجھے تھوڑا سا زہر لا دو۔"

"زہر؟" ___ مزارعہ نے گھبرا کر پوچھا ___ "کس کے لیے؟ زہر کسے دیں

گی؟ نہیں بی بی جی! میں زہر نہیں لاؤں گا۔"

"میں ابا جان کو ابھی جا کر بتاتی ہوں کہ تم نے کیا کرتوت دکھائی ہے" ___ عائشہ نے کہا۔

یہی خوف مزارعہ کو کھائے جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عائشہ کے باپ کو پتہ چلے گا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ عائشہ نے کہا ___ "تم بھاگ گئے تو کہاں تک جاؤ گے۔ ہم پولیس سے کہہ کر تمہیں زمین کے نیچے سے بھی نکال لیں گے۔"

غریب مزارعہ ایسے جال میں آیا جو اسے جکڑتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے عائشہ کے پاؤں میں بیٹھ کر کہا ___ "میں زہر لا دوں گا لیکن مجھے یہ تسلی دیں کہ آپ کسی کو یہ نہیں بتائیں گی کہ زہر میں نے لا کر دیا تھا۔"

عائشہ نے اسے تسلی دی۔ دوسرے دن مزارعہ نے وعدے کے مطابق کھیتوں میں عائشہ کو زہر کی پڑیا دے دی اور کہا کہ یہ باؤلے کتوں اور کھیتوں کے جنگلی چوہوں کو مارنے کے کام آتا ہے۔ عائشہ کہتی ہے کہ زہر دیکھ کر اس پر خوف طاری ہونے کی بجائے سکون طاری ہو گیا جیسے اس کے سارے دکھ دور ہو گئے ہوں۔ اس کے دل میں یہ ارادہ بھی آیا کہ یہ زہر خود کھا لے اور مزارعہ کو بھی کھلا دے مگر ارادہ بدل گیا۔ اس پہ انتقام کی آگ غالب آگئی۔

رات کو سونے سے پہلے اس کی سوتیلی ماں دودھ پیا کرتی تھی۔ نصف سیر دودھ اس کے لیے الگ گرم ہوتا تھا۔ باورچی خانہ عائشہ کے قبضے میں تھا۔ رات کو اس نے اس دودھ میں زہر ملا دیا۔ وہ سوتیلی ماں کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ سوچا کہ یہ عورت ہلاک ہو گئی تو وہ پکڑی جائے گی۔ زہر کی موت کو چھپانا

ناممکن ہوگا اور یہ معاملہ پولیس اور عدالت تک بھی جائے گا۔ اس کے دماغ پر خون سوار تھا۔

سوتیلی ماں آئی اور دودھ کا پیالہ اپنے کمرے میں لے گئی۔

عائشہ جلدی سو جایا کرتی تھی۔ اس رات اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کے کان اس کمرے کی طرف لگے ہوئے تھے جس میں اس کا باپ اور اس کی سوتیلی ماں سوتی تھی۔ ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر ہوا جا رہا تھا۔ غالباً تین چار گھنٹوں بعد اسے اس کمرے سے بڑی زور کی ابکائی کی آواز آئی۔ پھر اس سے زیادہ بلند آوازیں کراہنے کی سنائی دینے لگیں۔ سوتیلی ماں نے عائشہ کو آوازیں دیں۔ عائشہ دوڑی گئی۔ باپ کے کمرے میں وہ اس امید پر داخل ہوئی کہ اس کی سوتیلی ماں تڑپ رہی ہوگی، ابکائیوں سے مر رہی ہوگی اور تھوڑی دیر بعد مر جائے گی مگر وہ اچھی بھلی تھی۔ اس کی بجائے اس کا باپ پلنگ پر تڑپ رہا تھا۔ اسے ابکائی اتنی زور سے آتی تھی کہ وہ اُلٹا سیدھا ہونے لگتا تھا۔

عائشہ نے پوچھا کہ انہیں کیا ہوا ہے تو سوتیلی ماں نے بتایا کہ وہ اپنے لیے دودھ لے کے کمرے میں آئی تو عائشہ کے باپ نے کہا کہ وہ دودھ پینا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے اس نے رات کو کبھی دودھ نہیں پیا تھا۔ سوتیلی ماں نے اپنا دودھ اسے دے کر کہا کہ یہ پی لیں۔ باپ نے دودھ پی لیا اور کچھ دیر بعد اس کی یہ حالت ہو گئی۔

عائشہ کو چکر پہ چکر آنے لگے۔ دنیا رات کی طرح اندھیر ہو گئی۔ وہ دوڑی گئی اور ایک ہندو ڈاکٹر کو گھر سے جگا لائی۔ ڈاکٹر کے آنے تک اس کا باپ مر چکا

تھا۔ عائشہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہندو ڈاکٹر نے پہچان لیا کہ زہر دیا گیا ہے۔ اس نے وہ پیالہ دیکھا جس میں دودھ تھا۔ اس میں چند قطرے دودھ پڑا تھا۔ اس نے محلے میں سے ایک آدمی کو بھیج کر پولیس بلوالی۔ تھانیدار مسلمان تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔ مقتول کی قے کا نمونہ لے لیا گیا اور دودھ کے پیالے کو بھی پولیس نے قبضے میں لے لیا۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی۔ سوتیلی ماں نے بیان دیا کہ دودھ عائشہ نے دیا تھا۔ تفتیش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عائشہ جس باپ کی محبت کی خاطر اس حال تک پہنچی تھی وہ باپ اس کے اپنے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی حالت بہت ہی بُری ہو رہی تھی۔ تھانے جا کر اس نے تھانیدار کو صاف بتا دیا کہ زہر اسی نے دیا ہے لیکن وہ اپنی سوتیلی ماں کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ سوتیلی ماں نے یہ دودھ اس کے باپ کو پلا دیا۔

پولیس اتنی جلدی مطمئن نہیں ہو جایا کرتی۔ سوتیلی ماں سے پوچھا گیا تو (عائشہ کو بعد میں معلوم ہوا) اس نے یہ بیان دیا کہ عائشہ نے اپنے ہاتھوں اپنے باپ کو دودھ پلایا ہے۔ اس سے پولیس کو اور زیادہ گہرائی میں جانا پڑا۔

عائشہ کو زیرِ حراست لے لیا گیا اور سوتیلی ماں کو تفتیش میں شامل رکھا گیا۔ اس حادثے سے عائشہ کے بھائی کی غیرت بیدار ہو گئی۔ وہ تھانیدار سے ملا۔ یہ شخص شادی کے بعد گھر سے الگ ہوا تھا اب پانچ چھ سال بعد عائشہ سے ملا۔ عائشہ نے اس کی بہت بے عزتی کی۔ اسے کہا کہ وہ باپ کو اکیلا نہ چھوڑ جاتا تو ایسے حالات کبھی پیدا نہ ہوتے کہ باپ قتل ہو جاتا اور عائشہ تھانے میں ہوتی۔ اس کی شادی ہو چکی ہوتی اور وہ اپنے گھر میں آباد ہوتی۔

بھائی نے تھانیدار کو رشوت پیش کی جو تھانیدار نے نہیں لی۔ برادری کے لوگوں نے بھی عائشہ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن تفتیش کے مرحلے میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ عائشہ نے اپنے بھائی کو بھی سچی بات بتا دی۔ تھانیدار نے عائشہ میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ بتاتی ہے کہ تھانیدار نے اس پر ڈورے ڈالے۔ وہ کیس میں اتنی دلچسپی نہیں لیتا تھا جتنی عائشہ کی ذات میں لے رہا تھا۔ اس نے عائشہ سے وعدہ کیا کہ وہ اسے صاف بچا لے گا۔

عائشہ نے اسے کہا ——— "مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دو، اپنی عزت کا سودا نہیں کروں گی" ——— اس نے خودداری کا ایسا مظاہرہ کیا کہ تھانیدار اپنا سا منہ لے کے رہ گیا۔

تفتیش کے دوران کسی جگہ کوئی اور سنگین واقعہ ہو گیا۔ اس تھانیدار کو اُدھر بھیج دیا گیا۔ عائشہ اور اس کی سوتیلی ماں کے کیس کی تفتیش اس تھانیدار کے اسسٹنٹ کو دے دی گئی۔ وہ ہندو تھا۔ اس نے عائشہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اس کیس میں بچنے بچانے کی بہت گنجائش ہے بشرطیکہ اسے منہ مانگی رشوت دی جائے۔ اس نے بھی عائشہ کی عزت کا سودا کرنا چاہا۔ عائشہ نے اس پر بھی لعنت بھیجی۔ سوتیلی ماں بھی خوبصورت اور جوان تھی۔ بعد کی اطلاعوں کے مطابق اس نے اس ہندو تھانیدار کو اس کے مطالبے کے مطابق رشوت دے دی۔

تھانیدار نے جرم کا سارا وزن عائشہ پہ ڈال دیا۔ مسلمان تھانیدار آٹھ دس روز بعد واپس آیا تو کیس تیار ہو چکا تھا جس میں قتل کا الزام عائشہ پر تھا۔ مسلمان تھانیدار نے کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس نے عائشہ سے کہا۔ "تم نے مجھے غلط سمجھا تھا۔ میں تمہاری بے بسی سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ میں تمہارے سارے حالات سے واقف ہو چکا ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تم اخلاق اور کردار کی کتنی پکی ہو۔ یہاں عورتیں ملزم بن کر آتی رہتی ہیں۔ ان پر اس قدر خوف طاری ہو جاتا ہے کہ اس سے بچنے کے لیے اپنی عزت کی قربانی دے دیا کرتی ہیں۔ تم نے موت قبول کی عزت ہاتھ سے نہ جانے دی۔ میں تمہیں اپنے دل کی خواہش بتا دیتا ہوں۔ دو سال ہوئے میری بیوی مر گئی ہے۔ میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے جو اپنے حالات بتائے ہیں، ان حالات میں تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔"

"آپ میرے ساتھ سودا بازی کر رہے ہیں؟" ——— عائشہ نے پوچھا۔

"نہیں" ——— تھانیدار نے جواب دیا ——— "یہ تم کیس کے بعد محسوس کرو گی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے وعدہ نہیں لے رہا۔ میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کیس میں اس ہندو نے بہت گڑبڑ کی ہے۔ تمہارے بچنے کی صورت نکل آئے گی۔ میں کسی لالچ کے بغیر تمہاری مدد کروں گا۔ میرے دل میں جو کچھ تھا تمہیں بتا دیا ہے۔"

وہ عائشہ سے تین چار سال بڑا تھا۔ ہندو تھانیدار نے سوتیلی ماں کو شک سے پاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ عائشہ کو جیل میں بھیج دیا گیا اور مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔ سوتیلی ماں گواہ تھی۔ عائشہ نے تھانیدار کو سب کچھ بتا دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے زہر کہاں سے حاصل کیا تھا۔ اس نے دونوں تھانیداروں کے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ زہر کہاں سے آیا تھا۔

مقدمہ ذرا پیچیدہ تھا اس لیے بہت عرصہ لگ گیا۔ سیشن کورٹ میں مقدمہ پانچ چھ ماہ بعد گیا۔ اتنا ہی عرصہ سیشن کورٹ میں گزر گیا۔ مسلمان تھانیدار نے عائشہ کو بچانے کے لیے بہت کچھ کیا۔ اس کے بچنے کی صورت ویسے بھی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ شہادتیں کمزور تھیں۔ پھر بھی سیشن جج نے اسے سات سال سزائے قید دے دی۔ عائشہ کے بھائی نے اپیل دائر کی جو منظور ہو گئی۔ عائشہ کو بری کر دیا گیا۔ اس وقت تک وہ جیل میں رہی۔ اس کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بری ہو کر باہر آئی تو تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔

اپنا گھر اسے جیل خانے سے زیادہ ہولناک نظر آ رہا تھا۔ مکان پر اس کے بھائی نے قبضہ کر لیا اور اپنے باپ کی دوسری بیوی کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ بھائی نے جائداد کے کاغذات اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ عائشہ گھر آئی تو محلے اور برادری کی عورتیں ہجوم کر کے آ گئیں، عائشہ کی حالت بہت بری تھی۔ باپ کا غم تو اسے کھا ہی رہا تھا، دوسرا غم یہ کہ لوگ اسے باپ کی قاتل سمجھ رہے تھے۔

تین چار روز بعد اسے سہیلیوں نے بتایا کہ اس کی ماں نے اس کے خلاف بڑی ہی شرمناک کہانی مشہور کر دی ہے جو مختصراً اس طرح تھی کہ مزارعے کے ساتھ عائشہ کے مراسم قابلِ اعتراض تھے۔ باپ نے عائشہ کو برا بھلا کہا اور مزارعہ کو قتل کرانے کی دھمکی دی۔ عائشہ نے باپ کو زہر دے دیا۔ عورتیں ایسی دلچسپ کہانی کو جھٹلایا نہیں کرتیں بلکہ اس میں اضافے اور مبالغہ آرائی کر کے نشر کیا کرتی ہیں۔ عائشہ نے یہ کہانی سنی تو باپ کا غم بھول گئی۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ مزارعہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

ڈیڑھ ایک مہینہ گزرا تو بھائی نے اسے کہا کہ وہ اس کی شادی کا بندوبست

کرے گا۔ اس نے عائشہ کو یہ بھی بتایا کہ برادری میں اب اسے کوئی قبول نہیں کرے گا کیونکہ وہ اتنے بڑے جرم میں ملوث ہو چکی تھی۔ بھائی نے اسے کہا کہ تھانیدار اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ عائشہ کہتی ہے کہ تھانیدار واحد آدمی تھا جو اسے مظلوم اور بے گناہ سمجھتا تھا۔ عائشہ نے اسے قبول کر لیا۔ شادی کا دن طے ہو گیا۔

قریبی رشتہ دار عورتوں اور سہیلیوں نے اسے دلہن بنانا چاہا تو عائشہ نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا — "جس طرح اس گھر سے میرے باپ کا جنازہ خاموشی سے نکل گیا ہے۔ اسی طرح میں بھی چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤں گی —" اس نے بھائی سے کہا کہ بارات نہ آئے۔ تھانیدار آئے، نکاح پڑھا جائے اور وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی۔

بھائی نے اسے کہا کہ گھر کا سامان اس کے سامنے پڑا ہے۔ سارا لے جانا چاہے تو لے جائے، اسے جو چیز اچھی لگے اُٹھا لے جائے۔

عائشہ کا نکاح پڑھا گیا اور وہ ہچکیاں لے لے کے روتی ہوئی تھانیدار کے ساتھ چلی گئی۔ اسے ڈولی نصیب نہ ہوئی، اس کا جہیز نہ بنا، کسی نے اس کے ہاتھوں پر مہندی نہ لگائی۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ اتنی بڑی حویلی اس کی اپنی ہے۔ اتنی زیادہ زمین ہے مگر تھانیدار نے اپنے گھر لے جا کر اسے پہلی بات یہ بتائی کہ اس کے بھائی نے تھانیدار کو اس شرط پر رشتہ دیا ہے کہ وہ جائیداد سے عائشہ کا حصہ نہ مانگے۔ یہ اُس کے بھائی کی چال تھی۔ اس کے دل کو ایسی چوٹ لگی کہ اس نے جائداد کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔

تھانیدار نے اسے کہا کہ وہ اس کے بھائی کے ساتھ اپنا وعدہ نبھائے گا مگر عائشہ حصّہ لینا چاہے تو وہ اس کی مدد کرے گا۔

عائشہ نے کہا۔ "مجھے اس گھر میں صرف باپ کے ساتھ محبت تھی وہ نہیں رہا تو میں اس گھر کے قریب بھی نہیں جاؤں گی۔"

اس نے تھانیدار کے ساتھ دل لگا لیا۔ تھانیدار ویسا ہی خاوند ثابت ہوا جیسا وہ چاہتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عائشہ پر کیا گزری ہے اور اس کی جذباتی حالت کیا ہے۔ اس نے ہر لمحہ اس کے جذبات کا خیال رکھا۔ عائشہ کا غم ہلکا ہونے لگا۔

وقت گزرتا گیا۔ تین سال گزر گئے تو ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ اس وقت عائشہ اپنے آبائی قصبے میں نہیں تھی۔ تھانیدار وہاں سے دُور کے ایک قصبے میں چلا گیا تھا۔ وہ جگہ مشرقی پنجاب کے ان علاقوں میں سے تھی جہاں سے کوئی خوش قسمت مسلمان ہی ہندوؤں اور سکھوں سے بچ کر نکلا ہو گا۔ کسی مسلمان کا گھر سلامت نہیں رہا تھا۔ جدھر نگاہ جاتی تھی اُدھر مسلمانوں کی لاشیں نظر آتی تھیں۔

تھانیدار نے وہاں سے نکلنے کا انتظام کر لیا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ مہاجرین کی ایک ریل گاڑی پاکستان جا رہی ہے۔ ابھی ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ قتل و غارت شروع ہو چکی تھی۔ تھانیدار اور عائشہ ریلوے سٹیشن پر چلے گئے۔ ان کے پاس گھر کا کوئی سامان نہیں تھا۔ زیورات تھے اور کچھ نقدی جو تھانیدار نے اپنی کمر کے گرد قمیض کے نیچے باندھ لی تھی۔

سارے دن کے انتظار کے بعد ریل گاڑی آئی جس کی حالت یہ تھی کہ پائیدانوں

پر بھی لوگ کھڑے تھے اور ڈبّوں کی چھتوں پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی رُکی تو پلیٹ فارم پر مہاجرین کا جو ہجوم تھا وہ گاڑی پر ٹوٹ پڑا۔ چند منٹ رُک کر گاڑی چل پڑی۔ تھانیدار اور عائشہ نے ایک ڈبّے میں کھڑے ہونے کی جگہ بنا لی تھی۔ اگست کا مہینہ تھا۔ حبس اور گرمی سے دَم گھٹتا تھا۔ جان کا خوف بھی تھا۔ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دل میں یہی ایک خواہش رہ گئی تھی کہ خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔

ریل گاڑی چلتی رہی، رُکتی رہی، اس کے اندر ہجوم بڑھتا گیا۔ رات گزر گئی۔ صبح طلوع ہوئی تو گاڑی جالندھر سے گزر آئی تھی۔ بچّے بھوک، پیاس اور حبس سے بلبلا رہے تھے۔

گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی۔ عائشہ جس ڈبے میں تھی۔ اس کے سامنے ایک نل کھلا ہوا تھا۔ سٹیشن کے جنگلے کے باہر ایک ہجوم تھا جو ہندوؤں اور سکھوں کا تھا۔ پانی کا نل دیکھ کر بہت سے مہاجرین گاڑی سے اُترے۔ تھانیدار بھی اُتر گیا۔ ان لوگوں نے نل پر جا دھاوا بولا اور دھکم پیل کرنے لگے۔ جنگلے کے باہر جو ہجوم تھا وہ ان پیاسے مہاجرین پر ٹوٹ پڑا۔ عائشہ نے اپنے خاوند کو دیکھا۔ وہ بچ کر آ رہا تھا کہ دو ہندوؤں نے بیک وقت اس کے جسم میں چاقو اتار دیئے۔ انہوں نے ایک ایک وار اور کیا۔

عائشہ کی چیخیں نکل گئیں، مگر اس کی چیخیں ڈبے کی سینکڑوں چیخوں میں دب گئیں۔ نل کے ارد گرد لاشیں ہی لاشیں اور خون ہی خون تھا۔ کرپانوں، چاقوؤں اور خنجروں نے کسی مہاجر کو زندہ نہ چھوڑا۔ کافروں کا ہجوم گاڑی کی طرف آیا۔

ڈرائیور نے فوراً گاڑی چلا دی اور رفتار تیز کر دی۔

زیورات اور نقدی تھانیدار کی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اور تھانیدار کی لاش سٹیشن پر رہ گئی تھی۔ عائشہ کے سر پر اب دوپٹہ بھی نہیں تھا۔ وہ تھانیدار اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ عائشہ کو پانی پلانے کے لیے کوئی برتن نہیں تھا۔ تھانیدار نے کہا تھا کہ وہ دوپٹہ بھگو کر لائے گا اور عائشہ دوپٹہ منہ میں نچوڑ لے گی۔

اس کے بعد عائشہ کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتی۔ کہتی ہے وہ وقت یاد آتا ہے تو دل پر ہول طاری ہو جاتا ہے۔ لاہور میں آ کر وہ مہاجرین کے سیلاب میں بہتی رہی۔ ریفیوجی کیمپ میں چلی گئی۔ اس وقت لوگوں میں تازہ تازہ قومی جذبہ تھا۔ سب کو زیادہ خیال لاوارث عورتوں اور لڑکیوں کا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ہمارے محلے کے کوئی بزرگ اسے یہاں لے آئے۔ مہاجرین کا ایک خاندان ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے ایک کشادہ مکان میں آباد ہو گیا۔ اسی مکان کا ایک چھوٹا سا حصہ عائشہ کو دے دیا گیا۔ محلے والوں نے اسے برتن دیئے، کپڑے دیئے، بستر دیا اور اسے آباد کر دیا۔ اس نے محلے والوں کی یہ خدمت کی کہ ان کے بچوں کو قرآن پڑھانے لگی۔ اس وقت اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے رہنے سہنے کے سلیقے، انداز اور باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ کھاتے پیتے گھرانے کی شائستہ عورت ہے۔ اپنے خاندان کے متعلق اتنا ہی بتاتی تھی کہ سب مارے گئے ہیں۔

مسجد کے امام کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ لوگوں نے عائشہ سے کہا کہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ وہ نہ مانی۔ پھر ایک اور آدمی نے اسے شادی کا پیغام دیا۔

عورتوں نے اسے کہا کہ خاوند کے بغیر عورت کی کوئی زندگی نہیں، مگر اس نے کسی کو قبول نہ کیا۔ وہ ہر گھر کی فرد بنتی گئی۔ میں نے ہوش سنبھالا تو اس سے قرآن پڑھا۔

اب جب اس کے بال سفید ہو گئے ہیں، چہرہ جھریوں سے بھر گیا ہے تو یہ راز کھلا ہے کہ وہ کون ہے اور کیا تھی۔ جن لوگوں نے تیس سال بعد ہمارے محلے میں آ کر یہ راز فاش کیا ہے۔ ان سے عائشہ نے اپنے بھائی اور اس کے کنبے کے متعلق پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ وہاں سے کوئی خوش نصیب ہی نکلا ہو گا۔ یہ لوگ قتل و غارت سے ایک آدھ دن پہلے نکل آئے تھے۔